بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

Islamic & Intellectual Studies Magazine

(IISM)

اسلامک اور علم و دانش ریسرچ میگزین

وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ

شمارہ: جون 2025، ذی الحج 1446

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِينَ (آل عمران ۳:۹۷)

”لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے، اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے تو اسے معلوم ہو جانا چاہیے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔“

www.mubashirnazir.org

Islamic & Intellectual Studies Magazine

(IISM)

اسلامک اور علم و دانش ریسرچ میگزین

آج جدید دور نے دین و دنیا سے متعلق مختلف سوالات پیدا کر دیے ہیں۔ کہیں الحاد کا دور دورہ ہے تو کہیں خود ساختہ ادیان رائج ہیں۔ اِن حالات میں دین کی بلا تعصب، غیر جانبدارانہ اور قران و سنت کی روشنی میں درست ترجمانی ناگزیر ہے۔ اسی مقصد کے لیے اسلامک اور علم و دانش ریسرچ میگزین (Islamic and Intellectual studies Magazine) کا اجراء کیا گیا ہے، تاکہ دورِ جدید میں مختلف موضوعات سے متعلق دین کا صحیح نقطۂ نظر بلا کم و کاست قارئین تک پہنچایا جاسکے۔ اِس میگزین میں ایمان و اخلاق کی دعوت، تعمیر سیرت، اللہ اور آخرت کی معرفت، تاریخ، سوشل سائنسز اور دورِ حاضر کے تمام گمراہ کن نظریات کو پہچان کر ان سے بچنے کے حوالے سے موضوعات زیرِ بحث آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ اس سارے معاملے میں ہمارا حامی و ناصر ہو۔ آمین

سر پرستِ اعلیٰ: محمد مبشر نذیر

مدیر: رفعت نواب مصعب

نائب مدیر: محمد ثوبان

مجلس تحریر

محمد مبشر نذیر، رفعت نواب مصعب، محمد ثوبان

ڈاکٹر محمد عقیل، ڈاکٹر شکیل عاصم، حافظ محمد شارق

ڈاکٹر ظہور احمد دانش، جاوید رشید، محمد رضوان

عمر خطاب، محمد رضوان، شاہ فیصل ناصر، عبد الباسط

سلمان رضوان، طلحہ خضر، ڈاکٹر سید بلال ارمان

نوٹ: مدیر کا مراسلہ نگار سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

آفیشل ویب سائٹ: www.mubashirnazir.org

رابطہ کرنے، تحریریں، آراء اور سوالات بھیجنے کے لئے

Mubashirnazir100@gmail.com , refatnawab@gmail.com

فہرست مضامین

اسلامک اور علم و دانش ریسرچ میگزین

1	حج و عمرہ اور قربانی کے مسائل	محمد شکیل عاصم	3
2	خشکی اور تری میں فساد: انسانی اعمال اور رجوع الی اللہ	رفعت نواب مصعب	11
3	مایوسی سے نجات کیوں کر ممکن ہے؟ پارٹ 1	محمد مبشر نذیر	16
4	انسانی تاریخ اور تہذیبوں کا تصادم	محمد ثوبان	26
5	مسلمانوں کے طبقات	محمد رضوان	31
6	اپنی نسلوں کو دفاعی حربے سکھائیں	ڈاکٹر ظہور احمد دانش	33
7	تربیتِ اولاد (پارٹ-5)	وحید الدین خان	35
8	**سلسلۂ سوال و جواب**	محمد مبشر نذیر	45
	1. علوم القرآن کے متعلق سوال		45
	2. مرحومین کی جانب سے قربانی کی حیثیت		47
	3. نکاح میں ولی کی ضرورت کے متعلق سوالات		50
	4. بیوہ اور مطلقہ کی عدت کی حکمت کے متعلق سوالات		
	5. انگریزی زبان میں پوچھے گئے سوالات		52
9	تعلیمی و تربیتی کورسز کے ویب لنکس		57

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محمد شکیل عاصم

حج و عمرہ اور قربانی کے مسائل

حج کا لغوی معنی "ارادہ کرنے" کا ہے۔ جبکہ شرعی اصطلاح میں مخصوص وقت میں، مخصوص افعال سرانجام دینے کے لیے بیت اللہ کا قصد کرنے کو حج کہا جاتا ہے۔

حج کی فرضیت و اہمیت

شریعت اسلامیہ میں حج کی بڑی اہمیت وارد ہوئی ہے، یہ اسلام کا ایک اہم رکن ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِينَ. (آل عمران ۳:۹۷)

"لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے، اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے تو اسے معلوم ہو جانا چاہیے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔"

گویا جو اس حکم کی نافرمانی کرے گا تو اللہ تعالی نے اس سے بے زاری کا اظہار کیا ہے۔ اور اسی طرح سورۃ البقرۃ میں حج و عمرہ کو پورا کرنے کا حکما کہا ارشاد ربانی ہے:

وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰه. (البقرة ۲:۱۹۶)

"اور آپ لوگ حج و عمرہ اللہ تعالی کے لیے پورا کیجیے۔"

اور مزید فرمایا:

وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ. (الحج ۲۲:۲۹)

"اور انہیں چاہیے کہ وہ بیت اللہ کا طواف کریں۔"

احادیث میں بھی حج کی بہت زیادہ اہمیت وارد ہوئی ہے، چناچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر قائم ہے؛ اس بات کی گواہی دینا کہ اللہ تعالی کے علاوہ کوئی معبود برحق نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکوۃ دینا، رمضان کے روزے رکھنا اور بیت اللہ کا حج کرنا (مگر یہ اس کے لیے ہے) جو وہاں پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو۔" (السنن الکبری للبیہقی 265/9) اور اسی طرح روایات میں یہ بھی ہے کہ حج کرنے سے گناہ انسان گناہوں سے اس طرح پاک ہو جاتا ہے کہ گویا اس کی ماں نے اسے آج ہی جنم دیا ہے۔ (صحيح بخاري، كتاب الأضاحي، باب سنة الاضحية، حديث نمبر 5545) اور اسی طرح آپ نے فرمایا کہ: "ایک عمرہ دوسری دفعہ عمرہ کرنے تک کی درمیانی مدت کے لیے کفارہ ہے، اور اسی طرح

خالص حج کی جزا جنت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتی۔" (سنن ابی داؤد، کتاب الضحایا، باب فی الشاۃ یضحی بھا عن جماعۃ، حدیث نمبر 2810)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد ایک ہی حج ادا فرمایا تھا۔

حج کے احکام

حج کرنا کس شخص پر ضروری ہے؟

حج کرنا عاقل، بالغ اور صاحب استطاعت پر زندگی میں ایک دفعہ فرض ہے۔ صاحبِ استطاعت سے مراد یہ ہے کہ جس کے پاس حج کرنے کی جسمانی اور مالی طاقت ہو۔ ارشاد ربانی ہے:

وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِينَ. (آل عمران۳:۹۷)

"اور لوگوں کے ذمے بیت اللہ کا حج کرنا اللہ کا حق ہے، مگر جو اس طرف جانے کی استطاعت پاتا ہو، اور جس نے اس حکم سے انکار کیا تو اللہ تعالی جہان والوں سے بے نیاز ہے۔"

حج کن ایام میں کیا جاتا ہے؟

حج 13-8 ذوالحجہ کے درمیان ادا کیا جاتا ہے۔ چونکہ پہلے زمانوں میں سفر میں بہت وقت لگتا تھا، اس وجہ سے دو مہینے اور دس دن یعنی شوال، ذوالقعدہ، ذوالحجہ کے دس دنوں (یا ایک قول کے مطابق ذوالحجہ کے پورے مہینہ) کو حج کے مہینے قرار دیا گیا ۔ قرآن مجید میں اس کے لیے "اشھر الحج" کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ ذو القعدہ اور ذو الحجہ تو چار حرام مہینوں (Sacred Months) میں شامل ہیں کہ ان میں ہر قسم کے جنگ و جدال کو ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ ذو القعدہ اور ذو الحجہ کے علاوہ حرمت والے دو اور مہینے ہیں یعنی محرم اور رجب۔ عربوں کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پابندی ان کے ہاں حضرت ابراہیم علیہ الصلوۃ والسلام کے زمانے (c. 2000BC) سے چلی آ رہی تھی اور دور جاہلیت کے عرب بھی اس کا پورا احترام کیا کرتے تھے۔

حج کا طریقہ کار کیا ہے؟

حج کے طریقہ کار کو "مَنَاسَکِ حج" بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا طریقہ کا یہ ہے:

- حدودِ میقات میں پہنچ کر احرام (بغیر سلی ہوئی، سفید رنگ کی ایک تہہ بند اور ایک چادر) باندھ لیجیے یا اگر پہلے سے باندھی ہوئی ہوں تو میقات کی حدود میں نیت کر لی جائے۔ آج کل ہوائی جہاز کے سفر میں حجاج سوار ہونے سے پہلے ہی احرام باندھ لیتے ہیں اور میقات پر پہنچ کر نیت کر لیتے ہیں۔ جہاز میں حدودِ میقات شروع سے قبل اطلاع دے دی جاتی ہے۔

- حدود میقات شروع ہونے سے تلبیہ پکارنا شروع کر دیجیے۔ تلبیہ کے الفاظ یہ ہیں:
- **لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ۔ لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ۔ اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَاشَرِيْكَ لَكَ**(میں حاضر ہوں، اے اللہ میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں، آپ کا کوئی شریک نہیں، یقیناً سب تعریف آپ ہی ہی لیے ہے، ساری نعمتیں آپ ہی کی ہیں، اور ساری بادشاہت آپ ہی کی ہے، آپ کا کوئی شریک نہیں۔)
- پھر مسجد حرام پہنچ کر طواف کیا جائے، اور صفا و مروہ کی سعی کی جائے۔ اس پر حاجی کا عمرہ مکمل ہو جائے گا۔
- اگر حج میں کچھ دن باقی ہوں اور حاجی کی نیت یہ ہو کہ وہ حج اور عمرہ کو الگ الگ احرام سے ادا کرے گا تو اس کا عمرہ مکمل ہو چکا ہے۔ اب وہ احرام کھول سکتا ہے۔ اسے اصطلاح میں "حج تمتع" کہا جاتا ہے۔ اکثر لوگ یہی کرتے ہیں۔
- اگر حاجی کا ارادہ حج اور عمرہ کو ایک ہی احرام میں ادا کرنے کا ہو تو وہ عمرہ ادا کرنے کے بعد احرام پہنے رہے اور اس کی پابندیوں پر عمل کرتا رہے۔ اسے اصطلاح میں "حج قران" کہتے ہیں۔
- بعض حجاج، بالخصوص سعودی عرب میں رہنے والے صرف حج ادا کرتے ہیں، عمرہ نہیں کرتے۔ ان کے لیے اجازت ہے کہ وہ عمرہ ادا کیے بغیر براہ راست نیچے دیے گئے طریقے کے مطابق حج کر سکتے ہیں۔ اسے "حج افراد" کہتے ہیں۔
- 8 ذوالحجہ حج کا پہلا دن ہے۔ ظہر سے قبل منی کے لیے روانہ ہو جائیے۔ وہاں ظہر، عصر، مغرب، عشا ادا کریں۔ اور رات یہاں ہی قیام کیا جائے گا۔ اب حج کا دوسرا دن (9 ذوالحجہ) شروع ہو گیا ہے۔ نماز فجر بھی منیٰ میں ہی ادا کی جائے گی۔
- اس کے بعد آپ میدان عرفات کے لیے روانہ ہو جائیے، یہاں نمازِ ظہر و عصر ادا کرنے کے بعد سورج غروب ہونے تک آپ یہیں قیام کریں گے مگر نمازِ مغرب ادا نہ کیجیے۔
- سورج غروب ہونے کے بعد مزدلفہ جائیے اور مغرب و عشا وہاں اکٹھی پڑھیے اور رات یہیں قیام کیجیے۔
- حج کے تیسرے دن (10 ذوالحجہ) کو سورج نکلنے کے بعد منی واپس جائیے اور یہاں جمرۃ العقبی (بڑے شیطان) کو کنکریاں ماریے (اسے اصطلاح میں "رمی" کرنا کہا جاتا ہے)، قربانی کیجیے، اور اس کے بعد سر منڈوا کر یا بال کٹوا کر احرام کھول دیجیے۔
- اب آپ مکہ مکرم جا کر خانہ کعبہ کا طواف کر لیجیے جو کہ "طواف افاضہ" کہلاتا ہے۔ اگر 8 ذوالحجہ کو صفا و مروہ کی سعی نہ کی جا سکی ہو تو اب کر لیجیے۔ یہ طواف 10, 11, 12 ذوالحجہ میں سے کسی بھی دن کیا جا سکتا ہے۔
- طواف کر کے منی واپس آیئے۔ یہاں تینوں جمرات کو بالترتیب سات سات کنکریاں ماریے۔ 10, 11, 12 ذوالحجہ کے

ایام منی ہی میں گزاریے اور روزانہ تینوں جمرات کو کنکریں ماریے۔

- 12 ذوالحجہ کو تینوں جمرات کو کنکریاں ماریے اور سورج غروب ہونے سے قبل مکہ مکرمہ تشریف لے جائیے۔ اگر آپ چاہیں تو 13 ذوالحجہ کو بھی منی میں رک سکتے ہیں اور بہتر عمل یہی ہے۔
- اس کے بعد الوداعی طواف کیجیے۔ اس پر حج مکمل ہو جائے گا۔

عمرہ

عمرہ کرنے کا کیا طریقہ کار ہے؟

عمرہ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ میقات سے احرام باندھ کر عمرے کی نیت کی جائے۔ طواف بیت اللہ کرنے کے بعد سعی صفا مروہ کی جائے۔ اور اس کے بعد سر کے بال منڈوا دیئے جائیں یا کٹوا دیے جائیں۔ عورت سر سے تھوڑے سے بال کاٹ لے تو یہی کافی ہے۔ عمرہ سارا سال کیا جا سکتا ہے۔

حالتِ احرام میں کون کون سے کام کرنا حرام ہیں؟

احرام خواہ حج کا ہو یا عمرہ کا، شریعت اسلامیہ نے حالت احرام میں کچھ کرنے پر پابندی عائد کی ہے۔ ان میں سے کچھ تو عام حالت میں بھی حرام ہیں مگر اس حالت میں ان کی شناعت مزید بڑھ جاتی ہے، اور کچھ کام عام حالت میں تو درست اور جائز ہیں مگر اس حالت میں ان کو کرنے سے منع کیا گیا ہے:

- لڑائی جھگڑا کرنا۔
- جھوٹ بولنا۔
- کسی پر تہمت لگانا۔
- کسی کو گالی دینا یا فحش باتیں کرنا۔ کیونکہ ارشاد باری تعالی ہے کہ:

الْحَجُّ أَشْهرٌ مَّعْلُومٰتٌ فَمَن فَرَضَ فِيهنَّ الْحَجَّ فَلاَ رَفَثَ وَلاَ فُسُوقَ وَلاَ جِدَالَ فِي الْحَجِّ. (البقرة ۲:۱۹۷)

"حج کے مہینے سب کو معلوم ہیں جو شخص ان مقرر مہینوں میں حج کی نیت کرے، اُسے خبر دار رہنا چاہیے کہ حج کے دوران اس سے کوئی شہوانی فعل، کوئی فسق و فجور، کوئی لڑائی جھگڑے کی بات سرزد نہ ہو۔"

- خشکی کے جانوروں کا شکار کرنا۔ کیونکہ اللہ تعالی نے فرمایا:

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ وَمَنْ قَتَلَهُ مِنْكُمْ مُتَعَمِّدًا فَجَزَاءٌ مِثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ. (المائدۃ ۵:۹۵)

"اے اہل ایمان! احرام کی حالت میں شکار نہ ماریے، اور اگر آپ میں سے کوئی جان بوجھ کر ایسا کر گزرے تو جو جانور اس نے مارا ہو اُسی کے ہم پلہ ایک جانور اُسے مویشیوں میں سے نذر دینا ہو گا۔"

- جسم کے بال کٹوانا۔ کیونکہ ارشاد باری تعالی ہے:

وَلَا تَحْلِقُوا رُءُوسَكُمْ حَتَّى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ. (البقرۃ ۲:۱۹۶)

"اور اپنے سر نہ مونڈو جب تک کہ قربانی اپنی جگہ نہ پہنچ جائے۔"

- ناخن کاٹنا۔
- خوشبو لگانا۔ (جامع الترمذی، کتاب الاضاحی، باب ماجاء ان الشاۃ الواحدۃ تجزئ عن اھل البیت، حدیث نمبر 1505)
- موزے یا ایسے جوتے پہننا جو ٹخنوں سے کو ڈھک لیں۔ (جامع الترمذی، کتاب الاضاحی، حدیث نمبر 1501)
- سلے ہوئے کپڑے پہننا۔ (صحيح بخاري، كتاب الأضاحي، حديث نمبر 5569)
- مرد کے لیے سر ڈھانپنا۔ (صحیح مسلم۔ کتاب الاضاحی، حدیث 1971)
- درخت کی ڈالی توڑنا۔ (صحيح بخاري، حديث نمبر 1834)

اگر کسی خاتون کے حج کے دوران ایام مخصوصہ شروع ہو جائیں تو وہ کیا کرے گی؟

اگر حج کے دوران کسی خاتون کے ایامِ مخصوصہ (Menses) شروع ہو جائیں تو وہ مناسک حج ادا کرتی رہے گی البتہ وہ طواف بیت اللہ نہیں کرے گی۔ کیونکہ طواف کو احادیث مبارکہ میں نماز کی طرح ہی قرار دیا گیا ہے (اسی تو اس میں وضو کی شرط ہے اور وضو ٹوٹ جانے کی صورت میں نماز کی طرح طواف دوبارہ کرنا ہو گا۔) اور طواف رہ جانے کی صورت میں وہ حج کے اختتام پر مکمل کرے گی۔ یا اگر وہ مینسز کو روکنے والی ادویات بھی استعمال کرنا چاہتی ہے تو علما اس کی اجازت بھی دے رہے ہیں۔

حج کیوں فرض کیا گیا ہے؟

حج کے بہت سارے روحانی اور اخلاقی فوائد ہیں۔ ارشاد باری تعالی ہے:

لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ. (الحج۲۸:۲۲) ”تاکہ وہ دیکھ لیں ان فوائد کو جو ان کے لیے اس میں رکھے گئے ہیں۔“

حج مسلمانوں کو عملی زندگی میں متفق و متحد رکھنے کی عملی پریکٹس ہے،وہ اس طرح کہ مناسکِ حج میں ایسی حکمت کارفرما نظر آتی ہے کہ جس سے نسلی، لسانی، قومی امتیازات کا خاتمہ ہوتا ہے؛ لباس ایک، رب تعالی کو پکارنے کے لیے زبان ایک، احکام کا اطلاق سب پر بلا امتیاز۔ اسی طرح جو اخلاقی برائیاں عموما فساد کا باعث بنتی ہیں ان سے اس دورانیے میں خصوصی طور پر منع کر دیا گیا۔ بیت اللہ کا طواف گویا ہمیں یہ سکھارہا کہ تمہارا محور ایک ہونا چاہیے۔حج مؤمن کے ایمان میں اضافہ کا باعث ہے۔ وہ ان لمحات میں محسوس کرتا ہے کہ گویا وہ رب تعالی سے براہ راست ملاقات کر رہا ہے۔اس کے علاوہ حج سے معاشی فوائد کے حصول کی منصوبہ بندی کی جاسکتی ہے کیونکہ لوگوں کا بہت بڑا ہجوم یہاں جمع ہوتا ہے۔اس کے ساتھ ساتھ یہ امت مسلمہ کا عالمی اجتماع ہوتا ہے جو انہیں ایک ہی محور و مرکز سے وابستہ رکھتا ہے۔

قربانی

قربانی کے لیے عربی زبان میں لفظ ”أُضْحِيَةٌ“ بولا جاتا ہے۔ اسی مناسبت سے عیدِ قربان کو عید الاُضحی کہا جاتا ہے۔ اصطلاح میں اس سے مراد شریعت کے بتلائے گئے جانوروں میں سے کسی کو عید الاُضحی کے دن عید کے سبب سے، باری تعالی کا تقرب چاہتے ہوئے ذبح کرنا ہے۔ رب تعالی کا ارشاد گرامی ہے:

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ. (الکوثر۲:۱۰۸) ”آپ اللہ تعالی کے لیے نماز پڑھیے اور قربانی کیجئے۔“

اور اسی طرح فرمایا:

قُلْ إِنَّ صَلاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ. (الأنعام۱۶۲:۶) ”فرمادیجئے! میری نماز، میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا، سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔“

قربانی بھی شرائع سابقہ میں سے کیونکہ یہ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے۔

کیا قربانی کرنا ضروری ہے؟

اکثر علما کا موقف ہے کہ قربانی کرنا واجب نہیں بلکہ سنتِ مؤکدہ ہے جبکہ فقہ حنفی کے نزدیک یہ واجب ہے۔ ابو بکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے حوالے سے مروی ہے کہ وہ اس ڈر سے قربانی نہیں کیا کرتے تھے کہ کہیں یہ سمجھ لیا جائے کہ یہ ضروری ہے (احکام الاضحیۃ از شیخ صالح العثیمین، فصل الرابع؛ في شروط ما يضحى به، وبيان العيوب المانعة من الإجزاء۔) اور اسی طرح ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ: ”میں خوش حال ہونے کے باوجود قربانی اس لیے چھوڑ رہا

ہوں کہ کہیں لوگ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ یہ لازم وضروری ہے۔"(سنن أبو داود، کتاب الضحایا، باب مایکرہ من الضحایا، حدیث نمبر 2802)

قربانی کس وقت کی جائے گی؟

قربانی عید کی نماز کے بعد کی جائے گی۔ عید نماز سے قبل قربانی کرنے سے انسان قربانی کے ثواب سے محروم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: "جس نے نماز (عید) سے قبل جانور کو ذبح کر دیا تو اس نے اپنے اہل خانہ کو گوشت تو کھلا دیا مگر قربانی (کے ثواب) سے اسے کچھ بھی حاصل نہیں ہو گا۔" (صحیح بخاری حدیث 5545)

ذبح کرنے سے پہلے کیا پڑھنا چاہیے؟

قربانی کرنے سے پہلے یہ الفاظ پڑھنے چاہئیں:

بِسۡمِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ اَكۡبَرُ. "میں اس جانور کو اللہ تعالیٰ کا نام لے کر ذبح کرتا ہوں۔ جس کی شان یہ کہ وہ سب سے بڑا ہے۔" (سنن ابی داؤد 2810)

ایک جانور کتنے افراد کو کفایت کرے گا؟

عید الاضحیٰ کے موقع پر قربان کیا جانے والا ایک بکری یا مینڈھا اھل خانہ کو کفایت کرتا ہے۔ جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اپنی اور اپنے اہل وعیال کی طرف سے ایک بکری ذبح کرتا جو سارے گھر والے کھاتے اور دوسروں کو کھلاتے۔[i] جبکہ گائے میں زیادہ سے زیادہ سات اور اونٹ میں زیادہ سے زیادہ دس افراد شریک ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ: "ایک دفعہ ہم سفر میں تھے اور عید کا دن بھی سفر میں ہی آگیا۔ تو ہم نے گائے کے سات جبکہ اونٹ کے دس حصوں میں شریک ہوئے۔" (جامع ترمذی 1501)

کیا قربانی کا گوشت ذخیرہ کیا جا سکتا ہے؟

قربانی کا گوشت ذخیرہ کرنے کے ساتھ دوسروں کو بھی اس میں شریک کرنا چاہیے، کیونکہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ہے کہ: "کھایئے، دوسروں کو کھلایئے اور ذخیرہ بھی کر لیجیے۔" (صحیح بخاری 5569) تاہم اگر کوئی ایمرجنسی ہو جیسے سیلاب یا قحط کی صورتحال ہو اور لوگوں کو خوراک میسر نہ ہو تو پھر گوشت کو ذخیرہ کرنا جائز نہیں ہے۔ اس کی دلیل وہ حدیث ہے کہ جس کے مطابق کچھ قحط زدہ لوگ مدینہ میں آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن سے زیادہ قربانی کے گوشت کو ذخیرہ کرنے سے منع فرمایا۔ (صحیح مسلم 1971) اس کا مقصد ہی یہ تھا کہ ان قحط زدہ لوگوں کی مدد کی جائے۔

قربانی کی شرائط کیا ہیں؟

قربانی کی شرائط ذیل میں ہیں:

1. نیت: جس طرح دیگر کاموں میں اخلاص شرط اول ہے۔ بعینہ قربانی میں بھی یہی معاملہ ہے۔ اللہ تعالی نے قربانی کا خصوصی طور پر تذکرہ کر کے فرمایا:

لَن يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلٰكِن يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنكُمْ. (الحج ۳۷ :۲۲) ”نہ اُن کے گوشت اللہ کو پہنچتے ہیں نہ خون، مگر انہیں آپ کا تقویٰ پہنچتا ہے۔“

2. جانور کی جنس: جانور وہی قربان کیا جائے گا جس کی شریعت نے وضاحت کر دی ہے، یعنی اونٹ، بکری، بھیڑ اور گائے۔(سورۃ الأنعام 142:6، 14) کیونکہ شریعت کے نزول کے وقت ان جانوروں کے علاوہ بھی حلال جانور موجود تھے مگر ان کا تذکرہ نہیں کیا گیا، اس لیے قربانی انہی جانوروں کی جائے گی۔
3. قربانی والے جانور کی عمر: شریعت اسلامیہ نے قربانی والے جانوروں کی عمر کے حوالے سے بھی وضاحت کی ہے کہ یہ جانور دو دانتے ہوں۔ اور اونٹ عموماً چھٹے سال میں، گائے تیسرے اور بکری، بھیڑ اور دنبہ دوسرے سال میں داخل ہو جائیں تو دو دانتے ہو جاتے ہیں۔ اور اکثر علماء کہتے ہیں کہ دنبہ یا مینڈھا جب چھ ماہ کا ہو تو اس کی قربانی کرنا جائز ہے۔(احکام الاضحیۃ از شیخ صالح العثیمین، فصل الرابع؛ في شروط ما يضحى به، وبيان العيوب المانعة من الإجزاء۔)
4. جانور عیوب سے پاک ہو: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ: ”چار قسم کے جانور قربان نہیں کیے جاسکتے؛ جو نمایاں طور پر کانا، مریض، لنگڑا اور ٹانگ ٹوٹا ہوا ہو بغیر گودے والا ہو۔“ (سنن أبو داود، كتاب الضحايا، حدیث نمبر 2802)

قربانی کیوں کی جاتی ہے؟

قربانی اصل میں ابراہیم اور ان کے بیٹے اسماعیل علیہما الصلوۃ السلام کی یاد ہے، کہ جنہوں نے اطاعت خداوندی میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگانا گوارا کیا۔ گویا جانور کی قربانی ہمیں یاد دلا رہی ہوتی ہے کہ اطاعت الٰہی میں اپنا تن من دھن بھی قربان کرنا پڑے تو اس سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ قربانی کر کے انسان اپنے رب سے کہہ رہا ہوتا ہے کہ اے اللہ! آپ کا حکم ہو تو میں یہ جانور تو کیا اپنے آپ کو قربان کر دوں۔ اس جذبے کے ساتھ ساتھ اپنی خواہشات اور اسلام مخالف رسوم ورواج کو ہمیں اللہ تعالی کی محبت میں قربان کر دینا چاہیے۔ قربانی ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی اور ایثار کا پیغام بھی دیتی ہے۔

رفعت نواب مصعب

خشکی اور تری میں فساد: انسانی اعمال اور رجوع الی اللہ کی ضرورت

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا :

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُمْ بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (الروم:۴۱)

خشکی اور تری میں فساد ظاہر ہو چکا ہے، لوگوں کے اعمال کے سبب، تاکہ اللہ ان کو ان کے بعض اعمال کا مزہ چکھائے، شاید وہ رجوع کریں۔

قرآن کریم کی وضاحت

یہ آیت اس حقیقت کو بیان کرتی ہے کہ زمین پر تمام اجتماعی اور قدرتی آفات انسانی اعمال کا نتیجہ ہیں۔ ظلم، ناانصافی، معصیت، اور فطرت سے انحراف جب عام ہوتا ہے تو اس کے اثرات معاشرت، معیشت، اور قدرتی ماحول پر بھی مرتب ہوتے ہیں۔

انسانی اعمال اور اس کے نتیجے میں فساد کے کچھ مظاہر

وہ انسانی سرگرمیاں جو براہ راست قدرتی آفات اور معاشرتی بگاڑ کا سبب بنتی ہیں :

مظاہرِ فساد	بگاڑ کی نوعیت
کفر و فسق، حدودِ الٰہی کی خلاف ورزی	ایمانی، اخلاقی اور دینی
کرپشن، غربت، اور رشوت	معاشی عدم استحکام
آلودگی اور جنگلات کی کٹائی	ماحولیاتی بگاڑ اور بیماریاں
زلزلے، سیلاب، قحط	قدرتی
ظلم، ناانصافی، جنگیں	سماجی و معاشرتی زوال

ان مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ نے ایک متوازن دنیا بنائی ہے، اگر ہم حدود سے تجاوز کریں گے تو فساد برپا ہوتا ہے۔
اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَمَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَنْ كَثِيرٍ (الشوری:۳۰)

اور جو مصیبت تمہیں پہنچتی ہے وہ تمہارے اعمال کی وجہ سے ہے، اور اللہ بہت سے گناہوں کو تو معاف کر دیتا ہے۔

امتِ محمدیہ کے لیے رسول اللہ ﷺ کی دعا اور عصرِ حاضر کے تقاضے"

رسول اللہ ﷺ نے اپنی امت کے لیے تین دعائیں مانگیں

سَأَلْتُ رَبِّي ثَلَاثًا، فَأَعْطَانِي اثْنَتَيْنِ، وَمَنَعَنِي وَاحِدَةً؛ سَأَلْتُ رَبِّي أَلَّا يُهْلِكَ أُمَّتِي بِالسَّنَةِ، فَأَعْطَانِيهَا، وَسَأَلْتُهُ أَلَّا يُهْلِكَ أُمَّتِي بِالْغَرَقِ، فَأَعْطَانِيهَا، وَسَأَلْتُهُ أَلَّا يَجْعَلَ بَأْسَهُمْ بَيْنَهُمْ، فَمَنَعَنِيهَا"

صحیح مسلم، کتاب الفتن، حدیث:2890

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میں نے اپنے رب سے تین چیزوں کے سوالات کئے، پس اس نے مجھے ان میں سے دو عطا فرمادیں اور ایک سے روک دیا گیا۔ میں نے اپنے رب سے سوال کیا کہ میری امت کو قحط سالی کے ساتھ ہلاک نہ کیا جائے، پس مجھے یہ عطا کیا گیا۔ اور میں نے اس سے یہ سوال کیا کہ میری امت کو غرق کر کے ہلاک نہ کیا جائے، پس مجھے وہ بھی عطا کیا گیا۔ اور میں نے یہ سوال بھی کیا کہ انہیں آپس میں نہ لڑایا جائے، پس یہ مجھ سے روک دیا گیا۔

اس حدیث میں تین دعاؤں کا ذکر ہے:

1. قحط سالی سے بچاؤ
2. غرق ہونے سے نجات
3. باہمی جنگ و جدال سے حفاظت

اللہ تعالیٰ نے پہلی دو دعائیں قبول فرمائیں، مگر تیسری دعا قبول نہ کی۔

عذاب کی ان تینوں صورتوں کا ذکر سورۃ الانعام میں ہوا ہے:

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰٓ أَن يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّن فَوْقِكُمْ أَوْ مِن تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَيُذِيقَ بَعْضَكُم بَأْسَ بَعْضٍ (الانعام:۶۵)

کہہ دو! وہی قدرت رکھتا ہے کہ تم پر اوپر سے عذاب بھیجے یا تمہیں زمین میں دھنسائے، یا تمہیں گروہوں میں تقسیم کر دے اور تمہیں آپس میں ایک دوسرے کی سختی چکھائے۔

اس آیت مین تین اقسام کے عذاب کا ذکر ہے؛

1. **اوپر سے عذاب :** جیسے آسمانی آفات —طوفان، بجلی، پتھروں کی بارش وغیرہ۔
2. **نیچے سے عذاب :** جیسے زلزلے، زمین میں دھنس جانا، سیلاب وغیرہ۔
3. **فرقہ واریت اور باہمی لڑائی :** یعنی امت کا شیعہ و فرقوں میں بٹ جانا اور ایک دوسرے کے خلاف جنگ و جدال کرنا۔

یہی وجہ ہے کہ امت آج پہلے تیں عذابوں سے تو محفوظ ہے مگر فرقہ واریت، انتشار اور باہمی قتل و قتال کا شکار ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی تیسری دعا کی عدمِ قبولیت اور اس میں امت کے لیے تنبیہ

رسول اللہ ﷺ کی تیسری دعا — کہ امت آپس میں نہ لڑے — اللہ نے قبول نہیں فرمائی۔ اس میں بڑی حکمت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا:

وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا (الحجرات:۹)

"اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرواؤ۔"

یعنی اللہ نے یہ امکان رکھا کہ امت میں آپس کی جنگیں ہوں گی، لیکن حکم یہ دیا کہ ان کے درمیان اصلاح کی جائے۔

راہِ نجات: اصلاح اور رجوعِ الی اللہ

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا:

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَأَنتَ فِيهِمْ ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ (الأنفال: ۳۳)

"اللہ ان پر عذاب نہ دے گا جب تک آپ ان میں موجود ہیں، اور نہ ان پر عذاب کرے گا جب وہ استغفار کرتے رہیں۔"

یہ دو چیزیں — نبی کی موجودگی اور استغفار — امت کو اجتماعی عذاب سے بچاتی ہیں۔ اب ختم نبوت کے بعد نبی تو امت کے درمیان نہیں ہو سکتا، لہٰذا امت کا اپنی کرتوتوں سے توبہ و استغفار کرکے صراط مستقیم پر گامزن ہونا ہی امت کو عذاب سے بچا سکتا ہے۔ اگر ہم اپنی زندگیوں میں عدل، اخلاق، اور دیانت کو بحال کریں، تو اللہ کی رحمت ہمیں ان آزمائشوں سے بچا سکتی ہے۔

اصلاح کے لیے اتحادِ امت

اللہ تعالیٰ نے حکم دیا :

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا (آل عمران: ۱۰۳)	اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو، اور فرقہ بندی نہ کرو۔

اللہ کی طرف پلٹنے کی ضرورت

اللہ تعالیٰ ہمیں ان آفات اور فساد کو دیکھ کر اپنی طرف رجوع کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ان آفات اور مصیبتوں کا مقصد لوگوں کو بیدار کرنا ہے تاکہ وہ اپنے اعمال پر غور کریں، اللہ سے توبہ کریں اور اپنی زندگیوں کو درست کریں۔

اللہ کا وعدہ ہے:

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ (الرعد: ۱۱)	اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت کو نہ بدلیں۔

یعنی جب تک ہم اپنی حالت کو درست نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ کی مدد اور برکتیں ہماری زندگیوں میں نہیں آئیں گی۔ ہمیں اپنی نیتوں اور اعمال کو صاف کرنا ہوگا، اور اللہ کی رضا کے لیے اپنی زندگی کو درست سمت میں لے جانا ہوگا۔

آفات سے سبق سیکھنا

یہ آفات اور فساد صرف اللہ کی طرف سے عذاب کی علامت نہیں ہیں، بلکہ یہ ایک وارننگ ہیں، جو ہمیں اپنے ایمان و اعمال پر غور کرنے اور اللہ کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دیتی ہیں۔ جب ہم اپنے گناہوں پر توبہ کرتے ہیں اور اللہ کے سامنے سچے دل سے معافی مانگتے ہیں، تو اللہ اپنی رحمت اور عافیت سے ہماری زندگیوں میں سکون اور خوشحالی واپس لاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ ٱلْقُرَىٰٓ ءَامَنُوا۟ وَٱتَّقَوْا۟ لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَٰتٍ مِّنَ ٱلسَّمَآءِ وَٱلْأَرْضِ وَلَٰكِن كَذَّبُوا۟ فَأَخَذْنَٰهُم بِمَا كَانُوا۟ يَكْسِبُونَ (الاعراف:۹۶)	اگر ان بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے، تو ہم ان پر آسمانوں اور زمین سے برکات کے دروازے کھول دیتے مگر انہوں نے تو جھٹلایا تو ہم نے ان کو ان کے کرتوتوں کے سبب پکڑ لیا۔

یہ آیت ہمیں بتاتی ہے کہ اگر ہم اپنی زندگیوں میں اللہ کے احکام کو اختیار کریں، ایمان لائیں اور تقویٰ اختیار کریں تو تب ہی اللہ ہمیں اپنی برکات سے نوازے گا۔

رجوع الی القرآن والسنۃ

قرآن و سنت کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونا ہی ہمیں آزمائشوں سے نکال سکتا ہے۔

خلاصہ یہ کہ انسان کے اپنے اعمال ہی اس دنیا میں فساد اور مشکلات کا سبب بنتے ہیں۔ اگر ہم اللہ کی طرف رجوع کریں، توبہ کریں، عدل و انصاف کو قائم کریں اور قرآن و سنت کے پابند رہیں تو اللہ ہماری اس حالت سے ہمیں بچا سکتا ہے۔

محمد مبشر نذیر

مایوسی سے نجات کیوں کر ممکن ہے؟ پارٹ 1

اگر ہم روزمرہ کے اخبارات کا جائزہ لیں تو ہمیں روزانہ کسی نہ کسی کی خودکشی کی خبر نظر آئے گی۔ ایک اندازے کے مطابق دنیا بھر میں سالانہ دس لاکھ افراد خودکشی کرتے ہیں اور ایک سے دو کروڑ انسان اس کی کوشش کرتے ہیں۔ غریب اور پسماندہ ممالک میں خودکشی کرنے والوں کی شرح نسبتاً زیادہ ہے۔ اگر ہم خودکشی کی وجوہات کا جائزہ لیں تو صرف اور صرف ایک ہی وجہ نظر آتی ہے جسے "مایوسی" یا Frustration کہا جاتا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جس کا شکار تقریباً ہر انسان ہوتا ہے۔ بعض افراد میں یہ مایوسی اتنی شدت تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کے خاتمے کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ عام طور پر ان مسائل کے حل کی جو تجاویز دی جاتی ہیں، وہ اجتماعی سطح پر دی جاتی ہیں جن پر عمل حکومت یا بڑے بڑے ادارے ہی کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس ہماری اس تحریر کا مخاطب وہ لوگ ہوں گے جو کسی نہ کسی قسم کی مایوسی کا شکار ہیں۔ اس تحریر میں ہم یہ جائزہ لینے کی کوشش کریں گے کہ انسانوں میں مایوسی کیوں پیدا ہوتی ہے اور اس کے تدارک کا طریقہ کار کیا ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ نے اپنے دین میں ہمیں اس کے متعلق کچھ تعلیمات دی ہیں؟ ہم کن طریقوں سے اپنے اندر مایوسی کو کم کر سکتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ خوشیاں سمیٹ سکتے ہیں؟

مایوسی کی تعریف

علم نفسیات میں مایوسی کو خیبت بھی کہا جاتا ہے۔ پاکستان کے ممتاز ماہر نفسیات حمیر ہاشمی جن کی تصنیفات امریکہ اور کینیڈا کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہیں، مایوسی کی تعریف کچھ اس طرح کرتے ہیں: "مایوسی یا خیبت ہم اس احساس کو کہتے ہیں جو ایک شخص اپنی کسی خواہش کی تسکین نہ ہونے کے طور پر محسوس کرتا ہے، مثلاً اگر ایک طالب علم امتحان میں پاس ہونا چاہے لیکن فیل ہو جائے تو وہ خیبت یا مایوسی سے دوچار ہو گا یا اگر کوئی کھلاڑی کھیل کے میدان میں مقابلہ جیتنا چاہے، لیکن ہار جائے تو وہ خیبت کا شکار ہو گا۔" اس کے بعد وہ لکھتے ہیں: "اب اگر ہم اس تعریف میں اپنے آپ کا اور اپنے گردوپیش کے افراد کا جائزہ لیں تو ہم جان لیں گے کہ دنیا کا ہر شخص اپنی زندگی میں مایوسی یا خیبت کا شکار رہا ہے اور جب تک کسی شخص کے سانس میں سانس ہے، وہ خیبت سے دوچار ہوتا رہے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی بھی شخص کی تمام خواہشات کی تسکین اس کی مرضی کے عین مطابق ممکن ہی نہیں ہوتی، اس لئے وہ کسی نہ کسی حد تک مایوسی کا شکار رہے گا۔ تاہم کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن میں یہ احساس زیادہ شدید نہیں ہوتا اور کچھ لوگ ایسے ہیں، جن میں یہ احساس شدید حد تک پایا جاتا ہے۔" (حمیر ہاشمی، نفسیات، ص 772-773)

سادہ الفاظ میں اگر کوئی شخص کسی چیز کی خواہش کرے اور کسی وجہ سے وہ خواہش پوری نہ ہو سکے تو اس کے نتیجے میں اس کے دل و دماغ میں جو تلخ احساس پیدا ہوتا ہے، اسے مایوسی کہتے ہیں۔

مایوسی کی اقسام

مایوسی بنیادی طور پر دو طرح کی ہوتی ہے، ایک تو وہ جو ہمارے بس سے باہر ہے اور دوسری وہ جو ہمارے اپنے کنٹرول میں ہوتی ہے۔ ناقابل کنٹرول مایوسی کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کا بچہ زندہ رہے اور بڑا ہو کر اس کی خدمت کرے۔ کسی وجہ سے اس بچے کی موت واقع ہو جائے اور اس شخص کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکے تو یہ ناقابل کنٹرول مایوسی کہلاتی ہے۔ اسی طرح جب ہم فطری حوادث جیسے سیلاب، زلزلہ اور طوفان میں لوگوں کو ہلاک ہوتے دیکھتے ہیں تو اس سے ہمارے دل میں جو غم، دکھ یا مایوسی پیدا ہوتی ہیں وہ ناقابل کنٹرول ہوتی ہے۔

یہ وہ معاملات ہیں جن میں انسان کچھ نہیں کر سکتا۔ اس قسم کی مایوسی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے اپنے دین میں یہ ہدایت دی ہے کہ انسان کو چاہیئے کہ ایسے معاملات میں وہ اللہ کی پناہ پکڑے اور صبر اور نماز کی مدد سے اس مایوسی کو کم کرے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلاَةِ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلاَّ عَلَى الْخَاشِعِينَ. الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلاَقُو رَبِّهِمْ وَأَنَّهُمْ إِلَيْهِ رَاجِعُونَ-(البقرۃ 2:45-46) "صبر اور نماز سے مدد چاہو۔ بے شک یہ (اللہ سے) ڈرنے والوں کے علاوہ (دوسرے لوگوں کے لئے) بہت مشکل ہے۔ (اللہ سے ڈرنے والے تو وہ ہیں) جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ انہیں اپنے رب سے ملنا ہے اور انہیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔"

اس آیت میں یہ حقیقت بھی بیان کر دی گئی ہے کہ یہ آفات کوئی بڑی چیز نہیں ہیں اس لئے کہ ایک دن سب نے ہی اپنے رب سے ملاقات کرنے کے لئے اس دنیا سے جانا ہے۔ اگر انسان حقیقت پسند ہو اور کائنات کی اس بڑی حقیقت کو قبول کر لے تو پھر اسے صبر آ ہی جاتا ہے اور یوں اس کی مایوسی کے زخم مندمل ہو جاتے ہیں کیونکہ چند روزہ زندگی کے بعد ایک لامحدود زندگی اس کے سامنے ہوتی ہے جہاں نہ کوئی دکھ ہو گا اور نہ کوئی غم۔ اگر ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا جائزہ لیں تو ہمیں یہ معلوم ہو گا کہ آپ نے ہر ایسے معاملے میں اللہ کی پناہ پکڑی ہے اور جب بھی آپ کو کسی مشکل کا سامنا کرنا پڑا تو آپ نے نماز کے ذریعے اپنے رب کی طرف رجوع کر کے ذہنی سکون حاصل کیا اور اس مصیبت پر صبر کیا۔ اس کا احساس ہمیں آپ کی دعاؤں سے ہوتا ہے۔

دوسری قسم کی مایوسی وہ ہوتی ہے جو انسانی وجوہات سے ہوتی ہے اور اگر انسان چاہے تو اسے کم سے کم حد تک لے جا سکتا ہے۔ اس قسم کی مایوسی کی بہت سی وجوہات ہیں۔ ہم ان میں سے ایک ایک پر بحث کر کے ان کا حل تجویز کرنے کی کوشش کریں گے۔

مایوسی کی وجوہات

ناممکن خواہشات

مایوسی کی ایک بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم لوگ ایسی خواہشات کرتے ہیں جن کی تسکین ممکن ہی نہیں ہوتی مثلاً کوئی شخص اگر یہ خواہش کرے کہ اس کی جھولی میں سورج اور چاند آ جائیں اور وہ ان سے کھیلے یا پھر کوئی یہ سوچے کہ وہ گندم کی فصل سے چاول حاصل کرے۔ ظاہر ہے اس قسم کی مضحکہ خیز خواہشات پوری ہو ہی نہیں سکتیں۔

اگر ہم اپنے باطن کا تنقیدی جائزہ لیں تو ہم خود یہ محسوس کریں گے کہ ہم سے ہر ایک اس قسم کی بہت سی خواہشات ضرور رکھتا ہو گا۔ اس قسم کی مایوسی کا علاج صرف اور صرف یہ ہے کہ ہم اپنی خیالی دنیا میں رہنے کی بجائے حقیقت پسند بنیں اور حقیقت کو کھلے دل سے قبول کرنے والے بنیں۔ ایسے بھائی اور بہنیں، جو اکثر مایوسی اور ڈپریشن کا شکار رہتے ہوں، کے لئے ایک مناسب حل یہ ہے کہ وہ کچھ دیر کے لئے کسی پر سکون جگہ پر بیٹھ جائیں اور ایک کاغذ پر اپنی تمام ایسی خواہشات کو لکھیں جو پوری نہ ہوئی ہوں۔ اس کے بعد ان میں سے ان خواہشات پر نشان لگاتے جائیں جو غیر حقیقت پسندانہ ہوں۔ ہمیں یہ معلوم ہو گا کہ ہماری خواہشات کی اکثریت ایسی ہے جو غیر حقیقت پسندانہ ہے جنہیں پڑھ کو کوئی بھی شخص ہم پر ہنسے گا۔ جس شخص کی جتنی زیادہ خواہشات غیر حقیقت پسندانہ ہوں گی وہ اتنا ہی زیادہ مایوس ہو گا۔ کوشش کر کے ان تمام خواہشات سے نجات حاصل کر لیجیے۔ انشاء اللہ آپ خود محسوس کریں گے کہ اس کے بعد آپ کی مایوسی اور ڈپریشن میں واضح کمی ہو گی۔ جو خواہش پوری ہی نہ ہو سکتی ہو، اس کے غم میں گھلتے رہنے سے کیا حاصل؟

خواہشات کی شدت

مایوسی کی دوسری بڑی وجہ کسی خواہش کی بہت زیادہ شدت ہے۔ جو خواہش جتنی زیادہ شدید ہو گی، اس کی تسکین اتنی ہی زیادہ خوشی کا باعث بنے گی، لیکن اگر یہ پوری نہ ہو سکے تو پھر مایوسی بھی اتنی ہی زیادہ شدید ہو گی۔ ہمارے لوک قصوں میں ہیر رانجھا، سسی پنوں اور شیریں فرہاد اس کی مثالیں ہیں۔ انہوں نے ایک دوسرے کے حصول کی خواہش کو بہت زیادہ شدید کر لیا، جب یہ خواہش پوری نہ ہوئی تو وہ اتنے مایوس ہوئے کہ انہوں نے اپنی زندگیوں کا خاتمہ کر لیا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ بے چارے ہمارے لئے عبرت کا نشان ہیں لیکن بد قسمتی سے ہمارے قدیم اور جدید میڈیا نے ان سے عبرت حاصل کرنے کی بجائے انہیں ہیرو بنا کر پیش کیا جس کی وجہ سے ہمارے معاشرے میں محبت میں ناکامی پر انتہا درجے کی مایوسی اور بالآخر خود کشی کی وبا پھیلتی چلی گئی۔ اس کا شکار زیادہ تر خواتین نظر آتی ہیں کیونکہ ان میں خواہشات کی شدت بہت زیادہ ہوتی ہے۔

ہر اس حقیقت پسند کو، جو مایوسی سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے، چاہئے کہ اپنی خواہشات میں شدت کو کم سے کم کرے۔ کسی سے محبت کا معاملہ ہو، یا امتحان میں پاس ہونے کا، اچھا کھلاڑی بننے کی خواہش ہو یا بڑا افسر بننے کی، اس حقیقت کو جان لیجئے کہ دنیا میں ہر چیز اور ہر انسان ہمارا پابند نہیں ہے۔ اس لئے اپنی کامیابی اور ناکامی دونوں امکانات کو مد نظر رکھئے۔ جب انسان اپنی ناکامی کے امکان کو بھی مد نظر رکھے گا تو اس کی خواہش کی شدت میں نمایاں کمی واقع ہو گی۔

محبت کے معاملے میں یہ جان لیجئے کہ شادی سے پہلے معاملہ محض پسند یا ناپسند تک محدود رہنا چاہئے اور اسے عشق یا محبت میں تبدیل نہیں ہونا چاہئے۔ جب شادی ہو جائے اور بات کنفرم ہو جائے تو پھر اپنے شریک حیات سے دل و جان سے محبت کیجئے۔ جو کوئی بھی اس کا الٹ کرے گا، اسے مایوسی سے دوچار ہونا ہی پڑے گا۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ عشق کیا نہیں جاتا بلکہ ہو جاتا ہے، کوئی اچھی چیز نہیں بلکہ ایک نفسیاتی بیماری ہے جس کا مناسب نفسیاتی علاج ضروری ہے۔ انسان کے تمام جذبے اس کے اپنے کنٹرول میں رہیں تو وہ خوش رہتا ہے ورنہ مایوسیاں اور پریشانیاں اس کا مقدر بنتی ہیں۔

دوسروں سے بے جا توقعات وابستہ کرنا

مایوسی کی ایک بڑی وجہ دوسروں سے بے جا توقعات وابستہ کرنا ہے۔ ہم لوگ اپنے دوستوں، رشتہ داروں، عزیزوں، منتخب نمائندوں اور حکومت سے بڑی بڑی توقعات وابستہ کر لیتے ہیں۔ مثلاً ہمارا خیال ہوتا ہے کہ جیسے ہی ہم اظہار محبت کریں تو محبوب فوراً ہمارے قدموں میں سر رکھ دے۔ جب ہم پر کوئی آفت آئے تو ہمارا دوست بھی اس مصیبت کو اپنے سر پر لے لے۔ اگر ہمیں رقم کی ضرورت ہو تو تمام رشتے دار اور ملنے والے اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کر ہماری ضرورت کو پورا کریں۔ اگر ہماری کسی سے لڑائی ہو جائے تو ہر دوست ہماری طرف سے مردانہ وار لڑے۔ منتخب نمائندے اور حکومت ہماری غربت کو ختم کر دے۔ ہمارے کام کرنے کی جگہ ایسی ہو جہاں تنخواہ تو اچھی ملے لیکن کام زیادہ نہ کرنا پڑے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہر شخص کے حالات ایسے نہیں ہوتے کہ وہ ہماری ان توقعات پر پورا اتر سکے۔ اگرچہ بعض لوگ تو جان بوجھ کر کسی کے کام نہیں آنا چاہتے لیکن زیادہ تر دوست اور رشتے دار اپنی کسی مجبوری کی وجہ سے ہماری مدد نہیں کر سکتے۔ محبت کا معاملہ اس سے بھی مختلف ہے۔ اگر مجھے جس سے محبت ہے وہ بھی ایک آزاد انسان ہے۔ میری طرح اسے بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی کو بھی پسند کر لے۔ اسے بہت سی نفسیاتی و سماجی مجبوریاں بھی لاحق ہو سکتی ہیں۔ ضروری نہیں کہ اگر وہ مجھے پسند ہے تو میں بھی اسے پسند آؤں۔ بالعموم محبت کرنے والے تو بہت ہی بڑے بڑے ہوائی قلعے تعمیر کرتے ہیں اور جب حقیقی دنیا میں ان قلعوں کے بکھرتے دیکھتے ہیں تو مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس طرح کے معاملات میں ہر انسان کو چاہئے کہ وہ دوسروں سے بالکل کوئی توقع وابستہ نہ کرے اور ہر کام کو اپنے زور بازو سے کرنے کی کوشش کرے۔ حقیقی زندگی میں اسے دوسروں سے کچھ نہ کچھ مدد تو مل ہی جائے گی۔ جب ایسا توقع کے بالکل خلاف ہو گا تو یہ امر اس کے لئے مایوسی نہیں بلکہ خوشی کا پیغام لائے گا۔

منفی ذہنیت

بعض لوگ منفی ذہنیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اگر زندگی میں انہیں چند ناکامیوں کا منہ دیکھنا پڑے تو وہ اسے پوری زندگی کا روگ بنا لیتے ہیں۔ اس کے بعد ان کی زندگی کا واحد مقصد اپنی مایوسی کو دوسروں تک منتقل کرنا ہی رہ جاتا ہے۔ یہ جب کسی محفل میں بیٹھتے ہیں تو مایوسی ہی کی بات کرتے ہیں، کسی کو خوش دیکھتے ہیں تو اسے اداس کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ہر چیز کے منفی پہلو کو نمایاں کرتے ہیں اور ایک مفکر کی دی گئی مثال کے مطابق مکھی کی طرح جسم کے اسی حصے پر بیٹھتے ہیں جو گلا سڑا ہو اور اس میں پیپ پڑی ہوئی ہو۔ اگر اپنی خوش قسمتی اور دوسروں کی بدقسمتی سے یہ شاعر، ادیب، کالم نگار، صحافی، ڈرامہ نگار، مصور، موسیقار، گلوکار یا اداکار بن جائیں تو اپنی اس مایوسی کو پورے معاشرے میں پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر انہیں کسی فن میں نقاد کی حیثیت حاصل ہو جائے تو پھر مایوسی پیدا کرنے والی ہر تحریر، ہر نظم، ہر نغمے، ہر تصویر اور ہر ڈرامے کو شاہکار اور شہ پارے کا درجہ بھی مل جاتا ہے۔ جو لوگ بھی ان سے متاثر ہوتے ہیں، ان کی زندگی پھر غم اور مایوسی کی تصویر بن جاتی ہے۔ جو کوئی بھی مایوسی ہی کو اپنا مقصد حیات بنانا چاہے اس کا تو کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا لیکن جو اس مایوسی سے نجات حاصل کرنا چاہے اس کے لئے لازم ہے کہ وہ ایسے لوگوں سے مکمل طور پر اجتناب کرے۔ اگر انہیں دور سے آتا دیکھے تو فوراً راستہ بدل لے۔ اگر کسی محفل میں انہیں بیٹھا دیکھ لے تو اس میں جانے ہی سے گریز کرے۔ اگر وہ گھر آ جائیں تو انہیں مایوسی پھیلانے والے موضوعات پر بات کرنے سے روکنے کے لئے کوئی اور موضوع چھیڑ کر ان سے جان چھڑانے کی کوشش کرے۔ ان کی تحریروں، نظموں، نغموں اور ڈراموں کا مکمل بائیکاٹ کرے۔ اگر آپ تھوڑا سا غور کریں تو اپنے ارد گرد پھیلے ہوئے معاشرے میں سے ایسے لوگوں کو با آسانی بلیک لسٹ کر سکتے ہیں۔

فکری جمود اور فکر و عمل میں تضاد

مایوسی کی شاید سب سے بڑی وجہ ہماری سوچ میں جمود (Rigidity) اور ہماری فکر اور عمل میں تضاد ہے۔ سوچ میں جمود اس وقت پیدا ہوتا ہے جب انسان تجربے اور مشاہدے کے روشنی میں اپنے فکر و عمل کا تنقیدی جائزہ لینے زحمت نہ کرے۔ وہ اپنی ہر سوچ اور عمل کو درست سمجھے اور دوسروں کو غلط سمجھے۔ اپنی غلطیوں سے سبق سیکھنے کی بجائے ان کا الزام دوسروں کو دے اور اپنی ڈگر پر چلتا رہے۔

اس کی عام مثال یہ ہے کہ ایک شخص یہ چاہتا ہے کہ وہ کرکٹ کا بہت بڑا کھلاڑی بن جائے۔ اس مقصد کے لئے وہ کوئی زیادہ محنت نہ کرتا اور نہ ہی کرکٹ کی کوئی زیادہ پریکٹس کرتا ہے۔ وہ قومی ٹیم میں خود کو شامل نہ کئے جانے کا الزام خود کو دینے کی بجائے سلیکٹرز اور نظام ہی کو دیتا رہتا ہے۔ اسے اپنی خامیوں کا کوئی احساس نہیں ہوتا بلکہ وہ دوسروں ہی کو مورد الزام ٹھہراتا رہتا ہے۔ یہ درست ہے کہ اس طرح کے معاملات میں بسا اوقات دوسرے بھی جانبداری اور تعصب سے کام لیتے ہیں لیکن اگر انسان اپنے رویے میں لچک پیدا کرے اور فکر اور عمل کے تضاد کو دور کرتے ہوئے محنت کرے اور اپنی خامیوں کو دور کرے تو کچھ عرصے کی ناکامیوں کے بعد وہ کامیابی حاصل کر ہی لیتا ہے۔

اگر ذرا غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہو گی کہ یہ مایوسی صرف ہماری ذات تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ بحیثیت ایک قوم کے ہم اس کا شکار ہو چکے ہیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے قومی زوال کی وجہ صرف اور صرف بیرونی ممالک کی سازشیں ہیں۔ اگر میدان جنگ میں ہمیں شکست ہوتی ہے تو اس کا الزام ہم براہ راست دشمن کی سازش اور اندرونی غداروں پر ڈال دیتے ہیں۔ ہم یہ نہیں سوچتے کہ وہ کیا اسباب ہیں جن کی وجہ سے یہ غدار صرف ہماری طرف ہی پیدا ہوتے ہیں اور ہمارے دشمن کے ہاں کوئی غدار کیوں جنم نہیں لیتا؟ ہماری افواج اور انٹیلی جنس ایجنسیاں بھی دشمنوں کے خلاف سازشیں کرتی ہیں لیکن کامیاب صرف ان دشمنوں ہی کی سازشیں کیوں ہوتی ہیں اور ہمارے منصوبے اور چالیں خاک میں کیوں مل جاتے ہیں؟ ہمارا ہر حملہ ناکام اور ان کا ہر حملہ کامیاب ہی کیوں ہوتا ہے؟ اس کی کیا وجہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والے ہو کر بھی دنیا میں مغلوب ہیں اور ہمارا دشمن انہیں نہ مان کر بھی فاتح ہے؟

یہ مایوسی اس حقیقت کو نہ جاننے کی وجہ سے ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ اس کائنات کا نظام کو چند سائنسی قوانین کے ذریعے چلا رہا ہے اسی طرح اس نے قوموں کے عروج و زوال کے بھی کچھ قوانین بنائے ہیں۔ جو حضرات اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں ان کے لئے محترم دوست ریحان احمد یوسفی کی کتاب "قوموں کے عروج و زوال کا قانون اور پاکستان" کا مطالعہ بہت مفید ہو گا۔ میں یہاں صرف اتنا عرض کر دوں کہ اللہ تعالیٰ صرف اسی قوم کو اس دنیا میں عروج عطا کرتا ہے جو دوسری قوموں کی نسبت اخلاقی اعتبار سے بہتر ہو؛ جو اپنے دور کے علوم، سائنس اور ٹیکنالوجی میں اپنی معاصر اقوام پر برتری رکھتی ہو؛ جس میں دوسری اقوام کی نسبت بہتر تنظیم پائی جاتی ہو؛ اور جو اپنے وسائل کو بہتر طریقے سے استعمال کرنا جانتی ہو۔ تاریخ میں اس اصول سے استثنا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے رسولوں اور ان کے ساتھیوں کو حاصل ہوتا رہا ہے جن کو غالب کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ غیب سے مدد فرماتا رہا۔ ختم نبوت و رسالت کے بعد یہ مدد آ بھی سکتی ہے اور نہیں بھی۔ اس کی کوئی گارنٹی نہیں ہے کہ ہر معاملے میں ہم جو مرضی آئے غلطیاں کرتے پھریں اور اللہ تعالیٰ ہماری مدد کے لئے فرشتے نازل کرتا رہے۔ اللہ تعالیٰ سے بے جا امیدیں اور توقعات وابستہ کر کے اس کا امتحان لینے والے ہمیشہ ناکام ہی رہتے ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ہم اپنی معاصر اقوام کی نسبت اخلاقی اعتبار سے بھی کمزور ہیں، علمی اعتبار سے ہمارا شمار جاہل ترین اقوام میں ہوتا ہے، دوسری اقوام کی تنظیم (Organisation) کے مقابلے میں ہمیں ایک منتشر ہجوم (Crowd) ہی قرار دیا جا سکتا ہے اور وسائل کا استعمال شاید ہم ہی سب سے زیادہ برے طریقے سے کرتے ہیں۔ ان سب کے باوجود ہم یہ سمجھتے ہیں کہ قوموں کے درمیان جب مقابلہ ہو تو ہم ہی غالب ہوں اور دنیا پر ہمارا ہی جھنڈا لہرائے۔ ہماری دعاؤں کے نتیجے میں دشمن کے میزائلوں، بموں اور توپوں میں کیڑے پڑ جائیں۔ ہم پتھر بھی ماریں تو وہ ان پر ایٹم بم بن کر گرے اور وہ ہمیں ہائیڈروجن بم بھی مار دیں تو وہ ہمیں پھول کی طرح لگے۔ یہ ہوائی قلعے ذہنوں کو بڑے اچھے لگتے ہیں لیکن جب ہمیں کوئی تلخ حقیقتوں سے آشنا

کرنا چاہے تو ہم اسے رجعت پسند، دشمن کا ایجنٹ، ففتھ کالمسٹ اور نہ جانے کیا کیا خطابات دے ڈالتے ہیں۔ حقیقی دنیا میں جب معاملہ ہمارے ان تصوراتی (Fantanstic) خیالات کے برعکس پیش آتا ہے تو ہم ایک قومی مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

اگر ہم دوسروں کی سازشوں کا رونا رونے اور انہیں طعنے اور کوسنے دینے کی بجائے اپنے اخلاق اور علم کو بہتر بنانے کی کوشش کر لیتے تو اقوام عالم میں ہمارا مقام پہلے سے بہت بہتر ہوتا اور ہم ہر سازش کا مقابلہ بھی با آسانی کر لیتے۔ اس ضمن میں جتنی بھی کوششیں ہوئی ہیں، انہیں اللہ تعالیٰ نے کامیابی سے نوازا ہے۔ اس کی واضح مثال پاکستان کی صورت میں دیکھی جا سکتی ہے۔ پاکستان کے مسلمانوں کی عملی، علمی، معاشی اور اخلاقی اعتبار سے قرآن کے آئیڈیل کے مطابق تو نہیں لیکن 1930 کے مسلمانوں کی نسبت ان کی حالت بہر حال بہت بہتر ہے۔

معاشی وجوہات

مایوسی کی یہ وجوہات جو ہم نے اوپر بیان کیں زیادہ تر ایسی تھیں جن پر اگر انسان چاہے تو اپنے ذہن اور کردار میں مناسب تبدیلیاں کر کے قابو پا سکتا ہے۔ ان سب کے علاوہ ہمارے معاشرے میں مایوسی کی ایک اور قسم پھیلی ہوئی ہے جو سب سے زیادہ شدید ہے اور اس کے اثرات اتنے واضح ہیں کہ انہیں ہر شخص محسوس کر سکتا ہے۔ یہ ذرائع معاش کی کمی اور بے روزگاری سے پیدا ہونے والی مایوسی ہے۔ ملک بھر میں زیادہ تر خودکشیوں کی بنیاد یہی مایوسی ہے۔

چونکہ ہمارے معاشروں میں معاش کی ذمہ داری بالعموم مرد ہی سنبھالتا ہے اس لئے اس قسم کی مایوسی کا شکار زیادہ تر مرد حضرات ہی ہیں اور خودکشی بھی زیادہ یہی کرتے ہیں۔ بعض اوقات تو یہ پورے خاندان سمیت خودکشی کر لیتے ہیں۔ ہمارے مفکرین اور دانش ور اس مایوسی کے خاتمے کے لئے جو تجاویز پیش کرتے ہیں، ان پر عمل درآمد حکومت ہی کر سکتی ہے۔ ہم اس تحریر میں ان لوگوں کے لئے چند تجاویز پیش کر رہے ہیں جو اس قسم کی مایوسی کا شکار ہیں۔

اگر ہم بے روزگاروں اور اس کی بنیاد پر خودکشی کرنے والوں کے اعداد و شمار کا جائزہ لیں تو چند حیرت انگیز نتائج ہمیں معلوم ہوتے ہیں۔ معاشی مسئلے کی وجہ سے پر خودکشی کرنے والوں میں بلا تفریق مذہب چند کمیونٹیز سے تعلق رکھنے والے افراد کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان کمیونٹیز میں قبائلی پٹھان، میمن برادری، بوہری برادری، اسماعیلی برادری، قادیانی مذہب اور پارسی مذہب سے تعلق رکھنے والے افراد ہیں۔ راقم الحروف نے ان کمیونٹیز سے تعلق رکھنے والے چند افراد سے مل کر یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ ان میں خودکشی کرنے کی شرح اتنی کم کیوں ہے؟ اس سلسلے میں مجھے جو معلومات مل سکیں وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہیں۔

میمن برادری زیادہ تر پاکستان اور ہندوستان کے مغربی ساحلی شہروں میں آباد ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر کاروبار سے منسلک ہوتے ہیں جو بالعموم ان کے آباؤ اجداد کے زمانے سے ہی مالی طور پر مستحکم ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے اس برادری کے زیادہ تر افراد کو کوئی معاشی مسئلہ درپیش نہیں ہوتا۔ ان کی ایک بہت ہی قلیل تعداد کو اگر کسی وجہ سے معاشی مسائل کا سامنا کرنا ہی پڑتا

ہے تب ان کے اپنے رشتے دار ہی ان کی مدد کے لئے کافی ہوتے ہیں۔ رشتے داروں کے علاوہ ان کے بہت سے کمیونٹی سنٹر اور جماعت خانے بھی ہوتے ہیں جہاں فلاحی مراکز قائم کئے جاتے ہیں۔ ان مراکز میں اپنی برادری کے علاوہ دوسرے انسانوں کو بھی سہولیات فراہم کی جاتی ہیں۔ اس وجہ سے ان کے ہاں ایسے لوگ شاید بالکل ہی نہیں پائے جاتے جو معاشی مسئلے کی وجہ سے خودکشی پر مجبور ہو جائیں۔

بوہری برادری کے ہاں بھی اسی سے ملتا جلتا نظام پایا جاتا ہے۔ اسماعیلی برادری کا نظام کچھ مختلف ہے۔ ان کے ہاں ہر شخص کو اپنی آمدن کا کچھ حصہ اپنے امام، آغا خان کے پاس جمع کروانا پڑتا ہے۔ پاکستان کے اسماعیلیوں کی زیادہ تر تعداد شمالی علاقوں گلگت، ہنزہ وغیرہ میں آباد ہے۔ اس کے علاوہ ان کی بڑی تعداد کراچی شہر میں بھی رہتی ہے۔ کراچی میں رہنے والے زیادہ تر کاروبار یا اعلیٰ ملازمتوں سے متعلق ہیں۔ ان لوگوں کو کوئی بڑا معاشی مسئلہ درپیش نہیں۔ جماعتی سطح پر شمالی علاقوں میں انہوں نے بہت سے ترقیاتی منصوبے شروع کئے ہوئے ہیں جن سے وہاں کے لوگوں کے مسائل کو حل بھی کیا جاتا ہے اور انہیں روایتی ٹورازم انڈسٹری کے علاوہ روزگار بھی فراہم کیا جاتا ہے۔ اس کا اندازہ شمالی علاقوں کے دیہات میں جا کر ہوتا ہے۔ ان علاقوں میں جو نوجوان تعلیم حاصل کر لیتے ہیں، انہیں کراچی میں لا کر سیٹل کر دیا جاتا ہے اور اس سلسلے میں برادری کا ہر شخص اپنا مذہبی فرض سمجھ کر کوشش کرتا ہے۔ قادیانی حضرات کے ہاں بھی اس طرز کا نظام رائج ہے اور وہ اس نظام کی مدد سے اپنے مذہب کی تبلیغ اور فروغ کے لئے بھی بھرپور جدوجہد کر رہے ہیں۔

پاکستان کے عام مسلمانوں میں اس طرز کی کوششوں کی بہت کم مثالیں مل سکتی ہیں۔ اس کی ایک مثال لاہور کے اندرون شہر اور شمالی لاہور ہیں جہاں کسی حد تک اس طرز کی اجتماعی خدمات انجام دی جاتی ہیں جس کے نتیجے میں شہر کے ان علاقوں میں غربت اور مالی مسائل کی وجہ سے خودکشی کرنے کی شرح شہر کے دوسرے علاقوں کی نسبت بہت کم ہے۔

یہ سب طریق ہائے کار ایسے ہیں جو ایک پوری برادری یا کمیونٹی کی مدد سے ہی چل سکتے ہیں۔ اگر کوئی کمیونٹی اس طرز کا نظام اپنے ہاں رائج کر لے تو غربت، مہنگائی اور دوسرے معاشی مسائل کے اس جن کو اپنی حد تک قابو کر سکتی ہے۔ اس نظام کو قائم کرنے کے لئے ان کمیونیٹیز کے نظاموں کا تفصیلی مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر کسی شخص کو ایسی کمیونٹی میسر نہ ہو تو اس کے لئے بہترین مثال صوبہ سرحد اور بلوچستان کے قبائلی علاقوں سے تعلق رکھنے والے ان پٹھانوں کی ہے جو بڑے شہروں بالخصوص کراچی میں آباد ہیں۔

ہماری معلومات کے مطابق ان کے ہاں میمن برادری کی طرح کوئی بڑا اجتماعی نظام تو قائم نہیں ہے لیکن ان لوگوں نے اپنے سادہ طرز زندگی اور چھوٹے چھوٹے گروپس کی مدد سے جس طرح ان مسائل پر کافی حد تک قابو پا لیا ہے، اس کی کوئی اور مثال کسی پاکستانی کمیونٹی میں نہیں ملتی۔ شاید پاکستان سے باہر کسی اور ملک میں رہنے والے پاکستانی اس طریقے سے اپنے مسائل پر قابو پاتے ہوں۔

قبائلی علاقوں میں معاش اور روز گار کے مواقع نسبتاً کم ہیں۔ بعض علاقوں میں کسی حد تک زراعت اور کہیں کہیں گھریلو صنعت ہی ذریعہ معاش ہے۔ چند لوگ تجارت کرتے ہیں جس میں بالعموم بڑے شہروں سے مختلف چیزیں لا کر اپنے علاقوں میں فروخت کرتے ہیں۔ ان کے بہت سے نوجوان روز گار کی تلاش میں پاکستان کے تمام بڑے شہروں بالخصوص کراچی میں آتے ہیں۔ جب بھی کوئی نوجوان کراچی میں آتا ہے تو اسے اپنے رشتے داروں، قبیلے کے دوسرے افراد اور دوستوں کا ایک مستحکم نیٹ ورک پخیر راغلے کہتا ہے۔ اس کے یہ ساتھی بالعموم کوئی بہت امیر نہیں ہوتے۔ ان کا ذریعہ معاش بھی محض محنت مزدوری، چائے کے ہوٹلوں میں کام، بنگلوں میں چوکیداری، بسوں میں ڈرائیوری یا کنڈیکٹری، ٹیکسی یا رکشہ چلانا یا پھر ٹھیلوں وغیرہ پر ہونے والا کام ہوتا ہے۔ یہ لوگ محنت کا کوئی بھی کام کرنے میں بالکل شرم محسوس نہیں کرتے۔ نئے آنے والے ساتھی کے لئے انہوں نے کسی نہ کسی روز گار کا بندوبست کر رکھا ہوتا ہے۔ اس طرح یہ لوگ کچھ نہ کچھ کما ہی لیتے ہیں۔ ان میں سے کسی کی آمدنی بالعموم چار پانچ ہزار روپے ماہانہ سے زیادہ نہیں ہوتی لیکن اپنے سادہ طرز زندگی کی وجہ سے ان کے اخراجات بہت کم ہوتے ہیں۔ اس رقم میں سے یہ خود پر ہزار بارہ سو روپے خرچ کرکے باقی رقم اپنے گھر میں بھیج دیتے ہیں۔ ان کی خواتین بھی انہی کی طرح محنتی اور جفاکش ہوتی ہیں۔ وہ بھی اپنے گھر میں کوئی نہ کوئی کام کرکے تھوڑی بہت رقم کما رہی ہوتی ہیں۔ ہر گھرانہ اپنی کل آمدنی کو خرچ نہیں کرتا بلکہ اس میں سے بھی کچھ نہ کچھ بچا لیتا ہے۔ کچھ رقم جمع کرکے کچھ عرصے بعد یہ لوگ زمین یا کوئی جائیداد بھی خرید لیتے ہیں۔ اگر کسی شخص کو کوئی حادثہ پیش آجائے یا پھر وہ بیمار ہو جائے تو اس کا پورا گروپ اپنی آمدنی میں سے تھوڑی تھوڑی رقم جمع کرکے ایک معقول رقم اسے مہیا کر دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ لوگ باری باری کچھ عرصے بعد دو دو تین تین ماہ کے لئے اپنے گھر بھی چلے جاتے ہیں اور اس دوران اس کے دوسرے ساتھی اس کے کام کی دیکھ بھال بھی کرتے رہتے ہیں۔ یہ اسی نظام کی برکات ہیں کہ ان لوگوں میں بھیک مانگنے والوں کی تعداد بہت کم ملتی ہے اور مالی مسائل کی وجہ سے خودکشی کرنے والوں کی تعداد بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔

ایسے لوگ جو غربت اور مالی مسائل کا شکار ہوں، وہ دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے کی بجائے محض چند افراد کا گروپ بنا کر اپنے مالی مسائل کو کسی حد تک کم کر سکتے ہیں۔ مثلاً ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ایک جگہ کام کرنے والے چند مزدور، یا پھر ایک دفتر میں کام کرنے والے افراد مل کر یہ طے کریں کہ ایک دوسرے کے مالی مسائل کو کم کرنے میں وہ ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔ ایک مزدور کی ماہانہ آمدنی تین ساڑھے تین ہزار کے قریب ہوتی ہے۔ اگر دس مزدور مل کر یہ طے کر لیں کہ وہ روزانہ صرف پانچ روپے اپنے کسی قابل اعتماد ساتھی کے پاس جمع کروائیں گے تو ایک مہینے میں یہ لوگ باآسانی پندرہ سو روپے اور چھ ماہ میں نو ہزار روپے کی رقم جمع کر سکتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو اگر کسی دن مزدوری نہ ملے یا وہ بیمار ہو جائے یا پھر اسے کوئی اور مسئلہ درپیش ہو تو اس اجتماعی فنڈ سے ممکن حد تک اس کی مدد کی جا سکتی ہے۔ اس طرح یہ لوگ معمولی سی رقم ادا کرکے اپنے مسائل کو کسی حد تک کم کر سکتے ہیں۔ اس معاملے میں ضرورت صرف قابل اعتماد ساتھیوں کی ہے۔ مغربی ممالک میں اسی نظام کو

بہت وسیع پیمانے پر پھیلا کر Employment Insurance کا نظام وضع کیا گیا ہے۔ اس میں ہر شخص کو اپنی آمدنی کا ایک معمولی سا حصہ مثلاً 0.5٪ فنڈ میں جمع کروانا لازم ہوتا ہے۔ ان فنڈز کا انتظام فیڈرل یا سٹیٹ گورنمنٹ کرتی ہے۔ جب بھی کوئی بے روزگار ہوتا ہے تو اسے اسی فنڈ سے اتنی رقم ادا کر دی جاتی ہے جو اس کی کم از کم بنیادی ضروریات کو پورا کر سکے۔

شہری علاقوں میں رہنے والے ہمارے عام پاکستانی بھائیوں کے مالی مسائل کی ایک اور بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ہر شخص دفتر میں بیٹھ کر آرام و سکون سے کام کرنا ہی پسند کرتا ہے۔ تعلیم کو صرف اور صرف روزگار کے حصول کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ شروع ہی سے ہر بچے کے ذہن میں یہ بٹھایا جاتا ہے کہ اسے بڑا ہو کر افسر ہی بننا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے عام پڑھے لکھے نوجوان محنت کے کاموں سے جی چراتے ہیں اور بس افسری ہی کا خواب سجاتے ہیں۔ اہل مغرب کی ایک خوبی یہ ہے کہ ان کے ہاں کسی پیشے کو حقیر نہیں سمجھا جاتا۔ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے طالب علم عام طور پر تعلیم کے ساتھ ساتھ کسی پیٹرول پمپ پر کام کرنے، گاڑیاں دھونے، ہوٹلوں میں برتن دھونے یا اخبار بیچنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے۔ اس طرح وہ با آسانی اتنی رقم کما لیتے ہیں جو ان کے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لئے کافی ہو۔ ہر شخص ائر کنڈیشنڈ دفتر، بنگلہ، گاڑی اور خوبصورت سیکرٹری کے خواب نہیں سجاتا۔

اگر ہم اپنے رویے کو اس حد تک ہی تبدیل کرنے کے لئے تیار ہوں کہ کسی کام کو حقیر نہ سمجھیں اور جو کام بھی ملے اسے کرنے پر تیار ہوں تو کافی حد تک بے روزگاری کے مسائل پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو بھی جب تک ان کی پسند کی جاب نہ ملے، اور وہ جی کڑا کر کے اور طعنے دینے والوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کوئی نہ کوئی چھوٹا موٹا پارٹ ٹائم کام کر کے اپنے ذاتی اخراجات ہی پورے کر لیں تو یہ بے روزگار رہ کر ڈپریشن اور مایوسی کا شکار ہونے سے بہتر ہے کیونکہ under-employment بہر حال unemployment سے تو بہتر ہے۔

جاری ہے۔۔

محمد ثوبان

انسانی تاریخ اور تہذیبوں کا تصادم

انسان کی اس روئے زمین پر معلوم تاریخ مختلف کروٹیں بدلتی رہی ہے۔ عمرانی نقطۂ نگاہ کے حوالے سے یہ چیز ایک مسلّمے کی حیثیت رکھتی ہے کہ غالب تہذیب ہمیشہ دوسری تہذیبوں پر مختلف طریقوں سے اثر انداز ہوتی ہے۔ بلاشبہ انسان کی معلوم تاریخ میں ہمیشہ سے تہذیبوں کا تصادم ہوتا آیا ہے۔ اس تصادم کے کچھ منطقی نتائج ہوتے ہیں جن کی اہمیت سے انکار ناممکن ہے۔ بلاشبہ کچھ استثنائی واقعات بھی ہوتے ہیں مگر بہت کم۔ ذیل میں ہم انسانی تاریخ کے تین بڑے ادوار کا معروضی مطالعہ کریں گے کہ واقعی غالب تہذیب ہمیشہ غالب ہی رہتی ہے یا اس میں کوئی استثناء بھی پایا جاتا ہے؟ کیا آج دورِ جدید کی الحادی تہذیب مسلم تہذیب پر اثر انداز ہو رہی ہے؟ اگر ہاں تو کس حد تک؟ الحادی تہذیب کا مستقبل کیا ہو گا؟ مسلمانوں کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟

انسانی تاریخ کا دورِ اول

قران اور بائبل کے بیانات بتاتے ہیں کہ روئے زمین پر انسانی تاریخ کا آغاز حضرت آدم علیہ السلام سے ہوا۔ آدم علیہ السلام دینِ توحید کے علمبردار تھے۔ انسانی تہذیب جوں جوں ارتقاء پزیر ہوتی گئی، شرک کا چلن بھی عام ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ شرک ریاست کا مذہب قرار پایا۔ اس سارے دورِ شرک میں اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبروں کے ذریعے بذریعہ وحی انسان کو الوہی ہدایت دیتا رہا اور بہت ساری تہذیبوں کو تباہ بھی کیا گیا۔ لیکن شرک بطور مذہبی ریاست کے منہدم نہ ہو سکا اور انسانی تہذیبوں میں یہ ایک نمایاں رکن کے طور پر بہر حال شامل رہا۔ بلاشبہ اس شرکیہ تہذیب نے اپنی ذیلی تہذیبوں کو بھی متاثر کیے رکھا جس کے واضح آثار ہم آج بھی دیکھ سکتے ہیں۔ انسانی تاریخ کا یہ پہلا دور ساسانی اور رومی سلطنت کے عروج پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔۔ اِن سلطنتوں میں ریاست کا سرکاری مذہب شرک تھا گویا کہ شرک ایک غالب تہذیب کی حیثیت سے قائم تھا۔ اِس غالب تہذیب نے عرب کی جاہلی تہذیب کو بھی متاثر کیا اور عرب بھی اعلانیہ شرک میں مبتلا ہو گئے۔۔

انسانی تاریخ کا دورِ ثانی

انسانی تاریخ کا یہ دور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے شروع ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قران مجید کے ذریعے اپنی آخری ہدایت نازل فرمائی۔ یہی وہ دور ہے جہاں شرکیہ اور توحیدی تہذیب کا براہِ راست تصادم ہوا۔ شرکیہ تہذیب چونکہ ہوائے نفس پر قائم تھی اس لیے توحیدی تہذیب کے سامنے ریت کی دیوار ثابت ہوئی۔ تیئیس سال کے مختصر عرصہ میں توحیدی

تہذیب معلوم دنیا کی ایک غالب تہذیب بن کر منظرِ عام پر نمودار ہوئی۔ نظریاتی اور عملی میدان میں شرک کا قلع کما ہو گیا۔ اسلام کی غالب توحیدی تہذیب عرب کے صحراؤں تک ہی محدود نہ رہی بلکہ بہت جلد دورِ اول کی غالب تہذیبوں (ساسانی اور رومی سلطنت) نے بھی اِس کے اثرات قبول کیے اور شرک کا بطور سرکاری مذہب ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔۔ قران پاک اسے فتنہ کے اختتام سے تعبیر کرتا ہے۔

وَ قٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾

البقرة

ترجمہ : " تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے۔ پھر اگر وہ باز آ جائیں ، تو سمجھ لو کہ ظالموں کے سوا اور کسی پر دست درازی روا نہیں۔"

شرکیہ تہذیب اور مسلم تہذیب میں بنیادی جوہری فرق یہ تھا کہ اسلام میں ہر شخص دین کے معاملے میں فیصلہ لینے کے لیے آزاد ہو گیا۔ جبکہ شرکیہ تہذیب میں ہر شخص حکومتی مذہب کا پابند تھا۔

قران نے اس آزادی کو یوں بیان کیا ہے :

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ .البقرہ: ۲۵۶ ترجمہ : " دین کے معاملے میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے".

اسلامی تہذیب جونہی دنیا کی غالب تہذیب بنی تو دنیائے عالم اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ وحیٔ الٰہی پر مبنی دعوت نے لوگوں کے دلوں کو مسخر کیا اور لوگ جوق در جوق اسلام میں شامل ہوتے گئے۔ اِس تہذیب کی بنیاد چونکہ وحیٔ الٰہی پر تھی اس لیے مسلمان جب تک وحیٔ الٰہی پر عمل پیرا رہے دوسروں پر توحیدی تہذیب کا غلبہ بھی قائم رہا اور یہ لوگوں کو متاثر بھی کرتی رہی۔

قرونِ وسطٰی کے مسلمانوں نے جونہی وحیٔ الٰہی سے کنارہ کشی اختیار کی تو مسلمانوں کے تہذیبی زوال کا آغاز ہوا۔ اس زوال کے نتیجے میں ایک طرف تاتاری مسلم تہذیب پر حملہ آور ہوئے تو دوسری طرف سلاجقہ نے اسلامی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجائی۔ مسلمانوں کی بنائی ہوئی خود ساختہ تہذیب جو وحیٔ الٰہی پر مبنی تہذیب سے براہِ راست متصادم تھی منہدم ہو

گئی۔ یہاں خدا تعالیٰ کا وہ قانون بعینہٖ ہی حرکت میں آیا جو اُس (اللہ تعالیٰ) نے بنی اسرائیل کے لیے مقرر کیا تھا۔ اور مسلمانوں کو تنبیہہ کی تھی کہ اگر وہ بھی اسی روش کو اختیار کریں گے تو اُن کا انجام بھی بنی اسرائیل سے مختلف نہ ہو گا۔

فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ اُوۡلٰىهُمَا بَعَثۡنَا عَلَيۡكُمۡ عِبَادًا لَّنَاۤ اُولِىۡ بَاۡسٍ شَدِيۡدٍ فَجَاسُوۡا خِلٰلَ الدِّيَارِ‌ ؕ وَكَانَ وَعۡدًا مَّفۡعُوۡلًا ۝۵ ثُمَّ رَدَدۡنَا لَـكُمُ الۡكَرَّةَ عَلَيۡهِمۡ وَاَمۡدَدۡنٰكُمۡ بِاَمۡوَالٍ وَّبَنِيۡنَ وَجَعَلۡنٰكُمۡ اَكۡثَرَ نَفِيۡرًا۔ ۝۶ اِنۡ اَحۡسَنۡتُمۡ اَحۡسَنۡتُمۡ لِاَنۡفُسِكُمۡ‌ ۚ وَاِنۡ اَسَاۡتُمۡ فَلَهَا‌ ؕ فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ الۡاٰخِرَةِ لِيَسُوۡٓءٗا وُجُوۡهَكُمۡ وَلِيَدۡخُلُوا الۡمَسۡجِدَ كَمَا دَخَلُوۡهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوۡا مَا عَلَوۡا تَتۡبِيۡرًا۔ ۝۷ عَسٰى رَبُّكُمۡ اَنۡ يَّرۡحَمَكُمۡ‌ ۚ وَاِنۡ عُدْتُّمۡ عُدۡنَا‌ ۘ وَجَعَلۡنَا جَهَنَّمَ لِلۡكٰفِرِيۡنَ حَصِيۡرًا

(بنی اسرائیل ۵-۸)

ترجمہ : " آخر کار جب ان میں سے پہلی سرکشی کا موقع پیش آیا، تو اے بنی اسرائیل، ہم نے تمہارے مقابلے پر اپنے ایسے بندے اٹھائے جو نہایت زور آور تھے اور وہ تمہارے ملک میں گھس کر ہر طرف پھیل گئے ۔ یہ ایک وعدہ تھا جسے پورا ہو کر ہی رہنا تھا۔ اس کے بعد ہم نے تمہیں ان پر غلبے کا موقع دے دیا اور تمہیں مال اور اولاد سے مدد دی اور تمہاری تعداد پہلے سے بڑھا دی۔ دیکھو! تم نے بھلائی کی تو وہ تمہارے اپنے ہی لیے بھلائی تھی، اور برائی کی تو وہ تمہاری اپنی ذات کے لیے برائی ثابت ہوئی ۔ پھر جب دوسرے وعدے کا وقت آیا تو ہم نے دوسرے دشمنوں کو تم پر مسلط کیا تا کہ وہ تمہارے چہرے بگاڑ دیں اور مسجد ﴿بیت المقدس﴾ میں اسی طرح گھس جائیں جس طرح پہلے دشمن گھسے تھے اور جس چیز پر ان کا ہاتھ پڑے اسے تباہ کر کے رکھ دیں۔ ہو سکتا ہے کہ اب تمہارا رب تم پر رحم کرے، لیکن اگر تم نے پھر اپنی سابق روش کا اعادہ کیا تو ہم بھی پھر اپنی سزا کا اعادہ کریں گے، اور کافر نعمت لوگوں کے لیے ہم نے جہنم کو قید خانہ بنا رکھا ہے۔"

اس کے بعد مسلمانوں نے رجوع کیا اور مغلوب تہذیب کی حیثیت میں ہی وحیٔ الٰہی پر مبنی اقدار کو دوبارہ زندہ کیا۔ اپنی دعوتی ذمہ داریوں کو پورا کیا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تاتاری اور سلاجقہ، جو فاتحانہ تہذیب اور انسانی قدروں سے نا آشنا تھے، کے دل مسخر ہو گئے اور یوں وہ تاریخ رقم ہوئی جس میں غالب تہذیب مغلوب تہذیب سے متاثر ہوئی اور حلقہ بگوش اسلام ہوئی۔ اور یوں مسلم تاریخ کا سنہری باب دو عظیم سلطنتوں، سلطنتِ مغلیہ اور سلجوق سلطنت میں داخل ہوا۔ اسی منظر نامے کو شاعر نے یوں بیان کیا ہے :

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

یوں وحیٔ الٰہی پر مبنی تہذیب نے ایک دفعہ پھر اپنا اثر دکھایا خدائی قانون حرکت میں آیا اور مسلم تہذیب ایک دفعہ پھر دنیا کی غالب ترین تہذیب بن گئی۔ انسانی معلوم تاریخ کا یہ واحد استثناء ہے جس میں مغلوب تہذیب نے غالب تہذیب کو متاثر اور مسخر کیا۔

انسانی تاریخ کے اِس دورِ ثانی میں اُبھرنے والی مسلم تہذیب میں دوبارہ بگاڑ آنا شروع ہو گیا۔۔ مسلمانوں کو الٰہی احکامات کی خلاف ورزی نے دوبارہ مفلوک الحال بنا دیا۔ اِس دفعہ خدائی قانون پھر سے حرکت میں آیا اور مغربی باشندے اِس خود ساختہ تہذیب پر قہر بن کے ٹوٹے اور اپنا تسلط قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ انسانی تاریخ کا یہ دورِ ثانی لگ بھگ 1200 سال مختلف کروٹیں بدلتا رہا اور تقریباً انیسویں صدی کے نصف میں جا کر اختتام پذیر ہوا۔

انسانی تاریخ کا تیسرا اور جدید دور :

انسانی تاریخ کے اِس دور کا آغاز انیسویں صدی کے نصف سے شروع ہوتا ہے جب اہلِ مغرب دنیا کی سپر پاور بنے۔ اہلِ مغرب جہاں اپنے ساتھ سائنسی ایجادات لائے وہیں اپنی تہذیبی اقدار بھی لائے۔ اِس دفعہ پھر مغرب کی غالب تہذیب نے بڑے پیمانے پر دوسری مغلوب تہذیبوں کو متاثر کیا۔ سائنس و ٹیکنالوجی جو کہ جدید تمدن کی بنیاد تھی، کو تہذیبی اقدار سے نتھی کر دیا گیا اور سائنسی بیانات کو انکارِ خدا کی دلیل کے طور پر پیش کیا جانے لگا۔ اس غالب تہذیب سے مغلوب مسلم معاشروں نے بہت تیزی سے اثرات قبول کیے۔۔ اور یوں انہی اثرات کے بطن سے الحادِ جدید نے جنم لیا۔۔ آج کا دور بلاشبہ الحادی تہذیب کا دور ہے۔۔ الحادی مغربی تہذیب بہت سے لغو نظریات جن میں ہم جنس پرستی کا فروغ، فحاشی عریانی، قحبہ گری کو بطور قانونی پیشہ اپنانا وغیرہ کو بنیادیں فراہم کر رہی ہے اور اِسکے اثرات مسلم معاشروں میں بہت تیزی سے پھیل رہے ہیں۔ یوں آج بھی دورِ اول (شرکیہ اور مسلم تہذیب کا تصادم) کی طرح مغلوب مسلم تہذیب اور جدید الحادی تہذیب براہِ راست متصادم ہیں۔۔ بلاشبہ یہ انسانی تاریخ میں تہذیبوں کا سب سے بڑا تصادم ہے۔ اس تصادم میں الحادی تہذیب، جو کہ نظری طور پر بے بنیاد ہے، دنیا کی دوسری تہذیبوں کو متاثر کر رہی ہے۔ متاثر ہونے والی تہذیبوں میں آج کے مسلمانوں کی حیا باختہ اور خود ساختہ تہذیب بھی شامل ہے۔۔

انسانی تاریخ کا یہ تیسرا دور پوری آب و تاب کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ یقیناً مستقبل میں یہ دور بھی مختلف کروٹیں بدلے گا اور کسی منطقی انجام تک ضرور پہنچے گا۔۔

جدید الحادی تہذیب کا مستقبل :

الحادی تہذیب بلاشبہ نظری طور پر ایک بے بنیاد تہذیب ہے لیکن آج کے دور میں اسے غلبہ بہر حال حاصل ہے۔۔ بے بنیاد ہونے کی وجہ سے اِس کا منہدم ہونا یقینی ہے۔۔ لیکن ایسا نہیں ہے کہ یہ واقعہ بہت جلد رونما ہونے والا ہے۔اِسکے لیے اُس خالص وحیٔ الٰہی پر مبنی مسلم تہذیب کی ضرورت ہے جس میں وقتی طور پر مغلوب ہونے کے باوجود یہ صلاحیت موجود ہے کہ غالب تہذیب کو شکست دے سکے۔۔یقیناً جب وحیٔ الٰہی پر مبنی مسلم تہذیب کا تصادم بے بنیاد الحادی تہذیب سے ہو گا تو الحادی تہذیب کا منہدم ہونا یقینی ہے۔

مسلمانوں کی ذمہ داری :

آج کے مسلمان بلاشبہ احکامِ الٰہی سے واضح طور پر منحرف ہیں۔ جس کے اثرات مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں دیکھے جاسکتے ہیں۔۔یہی وجہ ہے کہ الحادی تہذیب بے بنیاد ہونے کے باوجود مسلم معاشروں میں پروان چڑھ رہی ہے۔ مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ ایمان و اخلاق پر مبنی اپنی تہذیبی اقدار کو پروان چڑھائیں۔۔ جدید سائنس و ٹیکنالوجی، جو جدید تمدن کی ضامن ہے، پر عبور حاصل کریں۔ بلاشبہ یہ ہی ایک طریقہ ہے جو آج کی جدید دنیا میں ہماری بقا کا ضامن ہے۔ الحادی تہذیب کی خود ساختہ اور بے بنیاد نظریاتی بنیادوں کا بغور مطالعہ کر کے غلطی واضح کرنا وقت کی اولین ضرورت ہے۔۔ان سب سے بڑھ کر مسلمانوں پر یہ فرض ہے کہ اپنی دعوتی ذمہ داری کا ادراک حاصل کریں اور امتِ وسط ہونے کا کردار ادا کریں۔۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرة)

ترجمہ : " اِسی طرح تو ہم نے تمہیں ایک امّتِ وَسَط بنایا ہے تا کہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔"

مسلمان جب اپنی مندرجہ بالا ذمہ داریوں کو پورا کریں گے تو بلاشبہ وہی استثناء دہرایا جائے گا جو تاتاریوں کے دور میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین !

محمد رضوان

مسلمانوں کے طبقات

مسلمانوں میں فرقوں کے علاوہ بھی ایک واضع تفریق موجود ہے جو اسے مختلف فقری رویے اور عملی رجحانات میں تقسیم کرتی ہے۔ یہ رویے اور رجحانات زندگی کے مختلف پہلوؤں میں نمایاں اور واضح ہیں۔ اسلام تو ان رویوں کی حمایت نہیں کرتا وہ تو اعتدال کا سبق دیتا ہے۔ قرآن وحدیث میں انسانی زندگی کو ایک متوازن انداز سے گزارنے کی مکمل رہنمائی موجود ھونے کے باوجود یہ رویے کہاں سے ہم میں آگئے۔ علم کی کمی ہے یا معاشرتی انحطاط؟

اللہ پر توکل مسلمانوں کی بنیادی صفت ہے لیکن بد قسمتی سے ہم نے توکل کو اپنی ہڈ حرامی کا جواز بنالیا ہے۔ توکل کا معنی ہم نے تقدیر کے کھاتے میں ڈال دیا ہے اور محنت سے جان چھڑانے کی دلیل بنالیا ہے۔ اپنی کمیوں اور کوتاہیوں کو ہم لوگ تقدیر کے کھاتے میں ڈال کر سمجھتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو ہمیں اس حالت سے نکال سکتا ہے۔ ہم نے توکل کو اللہ پر بھروسہ کرو اور جو کچھ ھو رہا ہے اسکو قبول کرنے کے کھاتے میں ڈال رکھا ہے جبکہ اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالتے نہ بدلنے کی کوشش کریں۔ اللہ نے جو اصول بنائے ہیں وہ صرف مسلمانوں کے لیے نہیں، نوع انسان کے لیے ہیں۔ پہلے اپنی اونٹنی کو باندھو اور پھر اللہ پر بھروسہ کرو۔

دوسرا طبقہ وہ ہے جو محنت اور مادی کامیابی کو اس قدر اہمیت دیتا ہے کہ اللہ کی ذات کو بالکل ہی پس پشت ڈال دیتا ہے اللہ صرف ان کی معاشرتی رسوم ورواج میں نظر آتا ہے۔ یہ شب وروز محنت کرتے ہیں جو کہ ایک اچھی بات ہے لیکن وہ اپنی کامیابیوں کو صرف اپنی محنت کا ثمر سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی اس جدوجہد میں اتنے آگے نکل جاتے ہیں کہ انہیں لگتا ہے کہ جو کر رہے ہیں وہ انکی محنت ہے اسلام کی بتائی ہوئی حدود دقیانوسی ہیں اور ہمیں آج میں رہنا ہے۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ انسان کچھ چاہ بھی نہیں سکتا جب تک اللہ نہ چاہیے۔ دماغ میں آنے والے آئیڈیاز اور خیالات بھی اسکی مرضی کے بغیر ممکن نہیں، ایک ایک سانس اس کی محتاج ہے۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ جو اللہ کے لیے عاجزی اختیار کرتا ہے، اللہ اسے بلند کرتا ہے۔

جو انسان اپنی کامیابی کو اللہ کا فضل سمجھتا ہے، اللہ اسے مزید کامیابیاں عطا فرماتا ہے، جبکہ جو شخص اپنی کامیابی کو صرف اپنی ذہانت اور محنت کا نتیجہ سمجھتا ہے، وہ اللہ کی نظر میں گر جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں دین و دنیا کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہے۔ یہ دو انتہاؤں پر ہم خود گئے ہیں۔ ہمیں نہ تو توکل کے نام پر کاہلی اختیار کرنی چاہیے، اور نہ ہی اپنی محنت اور کامیابی کو سب کچھ سمجھ کر اللہ کی قدرت کو فراموش کرنا چاہیے۔ اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انسان زندگی کے ہر معاملے میں پوری کوشش اور محنت کرے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرے کہ تمام امور کا انجام اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

قرآن تو کہتا ہے جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو، اور اللہ کو کثرت سے یاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ اصحابہ اکرام کو کچھ لوگ اس طرح پیش کرتے ہیں جیسے وہ کوئی انوکھی مخلوق تھے لیکن مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے وہ بھی ہمارے جیسی ہی جبلت کے ساتھ پیدا ہوئے ہیں۔ وہ دن میں اپنے کاروبار اور معاشی سرگرمیوں میں مصروف رہتے تھے اور رات کے وقت عبادت اور تہجد میں گزارتے تھے۔ وہ کبھی بھی دنیا کو ترک نہیں کرتے تھے اور نہ ہی اپنی آخرت کو نظر انداز کرتے تھے۔ ان کی زندگیوں میں ایک کامل توازن تھا جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات پر مبنی تھا۔

ہمارے سماج میں، خاص طور پر نوجوان نسل میں، یہ توازن برقرار رکھنا بہت ضروری ہے۔ کیونکہ مادی دنیا کی چکاچوند اور دولت کی دوڑ میں، اکثر لوگ روحانیت اور معنویت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ دوسری طرف، کچھ لوگ دینی علوم اور روحانیت کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ وہ دنیاوی معاملات میں پسماندہ ہو جاتے ہیں۔ دونوں ہی رویے اسلامی تعلیمات کے منافی ہیں۔ ہمیں دنیاوی علوم اور دینی علوم میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ محنت اور کامیابی کے ساتھ ساتھ، اللہ کا شکر ادا کرنا اور اپنی کامیابی کو اللہ کا فضل و کرم سمجھنا ضروری ہے۔

ہم میں اکثر لوگ مصیبت کے وقت اللہ کی مرضی کہہ دیتے ہیں، جو کہ صحیح ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی فہم ہونا ضروری ہے کہ مصیبت کا سامنا کرنے کے لیے تمام ممکنہ کوششیں کرنا بھی ہماری ذمہ داری ہے۔ اسلام میں معاشی پہلو کو بھی اہمیت دی گئی ہے۔ زکاۃ، صدقات، خیرات اور دوسرے معاشی نظام اس کی واضح مثال ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ، اسلام میں دولت کو مقصد حیات نہیں بلکہ زندگی گزارنے کا ذریعہ اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا وسیلہ سمجھا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں حلال کمائی پر بہت زور دیا گیا ہے اور حرام کمائی کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔ مسلمان معاشرے کی بہتری اور کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ ہم توکل اور کوشش کے درمیان ایک متوازن راستہ اختیار کریں محنت اور عمل کے بغیر توکل ایک ناقص سوچ ہے، اور اللہ کے فضل کے بغیر محنت پر مکمل انحصار بھی ایک بھول ہے۔ ہمیں اپنے رویوں میں توازن لانا ہو گا، اور اس توازن کے ذریعے ہم ایک کامیاب، مستحکم اور روحانی طور پر مضبوط معاشرہ تشکیل دے سکتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی زندگیوں میں توازن قائم کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں دنیا و آخرت کی بھلائی سے نوازے۔

ظہور احمد دانش

اپنی نسلوں کو دفاعی حربے سیکھائیں

زمانے بدلتے ہیں، جنگیں صرف ہتھیاروں سے نہیں، نظریات سے بھی لڑی جاتی ہیں۔ آج کی جنگوں میں ٹینکوں سے زیادہ ٹریننگ، بندوقوں سے زیادہ بصیرت، اور گولیوں سے زیادہ گفتار مؤثر ہو چکی ہے۔ ایسے میں ایک باشعور قوم وہی ہو سکتی ہے جو اپنی نئی نسل کو صرف کتابوں میں قید نہ رکھے، بلکہ ان کے ذہن و دل کو شعور، دفاع، اور قیادت کے رنگ میں ڈھال دے۔

دفاع کا پہلا مورچہ ماں کی گود اور باپ کی باتوں سے شروع ہوتا ہے۔ جب ماں بچوں کو سلاتے وقت "لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری" سنائے، اور باپ روز صبح ناشتہ کرتے ہوئے غزوہ بدر کی حکمت بتائے، تو بچہ صرف پڑھا لکھا نہیں، وفادار اور مدبر پیدا ہوتا ہے۔ بچوں کو چھوٹے کھیلوں میں حب الوطنی شامل کریں۔ یقین کیجیے، یہ ننھی سرگرمیاں بڑے انقلاب کی بنیاد بن سکتی ہیں۔

ہمارے تعلیمی ادارے اگر بچوں کو صرف معاشیات، سائنس یا جغرافیہ پڑھائیں، لیکن ان کے دل میں وطن، دین، اور عزتِ نفس کی قدر نہ جگائیں، تو وہ ذہین ضرور ہوں گے، لیکن غیرت مند نہیں۔ ہر جماعت میں اسلامی ہیروز کے ابواب شامل کریں: جیسے طارق بن زیاد، محمد بن قاسم، صلاح الدین ایوبی، اور علامہ اقبال۔ بچوں کو انہیں آزمائش میں ڈٹنا، بھوک میں صبر کرنا، اور سچائی پر قائم رہنا سکھائیں۔ یہی وہ صفات ہیں جو میدانِ جنگ سے پہلے انسان کے اندر پختہ ہوتی ہیں۔

آپ نے دنیا کا منظرنامہ تو دیکھ لیا ہے اب اس دنیا میں باوقار جینے کے لیے جرئیح اور دلیر ہونا بہت ضروری ہے۔ دفاع کی دنیا کا جاننا بہت اہم ہو گیا ہے۔ لہذا اگر ہم چاہتے ہیں کہ مسلم امۃ مظلوم نہ بنے۔ بلکہ جرات کے ساتھ دنیا میں جی سکے تو اس کے لیے ہمیں اپنے بچوں کو فزیکل منٹلی ہر اعتبار سے تیار کرنا ہو گا۔ جسمانی فٹنس کو صرف کھیل یا ورزش نہ سمجھا جائے، بلکہ یہ ایک روحانی، فکری، اور قومی فریضہ ہے۔ اسکولوں میں مارشل آرٹس، تیراکی، گھڑسواری، اور تیراندازی کو لازمی حصہ بنایا جائے۔ ہفتہ وار قوم پرست کیمپنگ کروائیں جہاں بچے خیمے لگانا، راستہ ڈھونڈنا، اور تناؤ میں فیصلہ سازی سیکھیں۔ بچوں میں مشکل وقت میں ایک دوسرے کے لیے کھڑا ہونا سکھائیں: یہ اصل دفاع ہے، جس سے فوجیں بنتی ہیں۔

میڈیا اب جنگ کا سب سے تیز ہتھیار ہے۔ بچوں کے لیے متبادل اسلامی کارٹون، ڈاکیومنٹری، اور ڈرامے بنائیں ،نوجوانوں کو سائبر سیکیورٹی، فیک نیوز کی پہچان، اور ڈیجیٹل اسلحہ کا استعمال سکھائیں۔ انہیں سکھائیں کہ لائیک اور شیئر کی طاقت سے بھی دشمن کے پروپیگنڈے کو شکست دی جا سکتی ہے۔

قارئین:

ایمان وہ قلعہ ہے جس میں قومیں پروان چڑھتی ہیں۔ بچوں کو فجر میں اٹھانے کا عادی بنائیں، قرآن کے وہ مقامات یاد کروائیں جہاں اللہ نے مؤمنوں کو جنگی وقت میں صبر، ہمت، اور یقین کا حکم دیا۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ صرف عبادت نہیں بلکہ دفاعی روحانی تربیت ہے۔ ان کا شعوری شعور بچوں میں منتقل کریں۔ باپ اگر گھر میں حلال رزق، سچائی اور خدمت کا ماحول پیدا کرے۔ ماں اگر حیا، غیرت، اور عزت سکھائے۔ تو یہ خاندان نہیں، فکری چھاؤنی بن جائے گا۔

قارئین:

اگر ہمیں اپنے ملک، اپنے نظریے، اور اپنے ایمان کا دفاع چاہیے، تو ہمیں اپنی نسلوں کو قرآن کی روشنی، سیف کی حکمت، اور کردار کی پختگی سے آراستہ کرنا ہو گا۔

یاد رکھیے، دشمن ہمارے بچوں کے دل سے غیرت، اور ذہن سے نظریہ چھیننا چاہتا ہے۔ اگر ہم نے آج اپنے بچوں کو فکری قلعہ نہ دیا... تو کل طاغوتی طاقتیں ہمیں کمزور کر کے ہمیں قصہ پارینہ بناتی چلے جائیں گے۔

میں ایک پُرامن شہری ہوں۔ امن کا داعی ہوں۔ امن کو پسند کرتا ہوں۔ امن کا پرچار کرتا ہوں پر امن لوگوں کی صحبت میں رہتا ہوں۔ لیکن کچھ حقائق ایسے ہوتے ہیں جنھیں بھر وقت مان لیا جائے تو ہی بہتر ہے۔ میں طبیعتاً بہت نرم اور ٹھنڈا آدمی ہوں بہت طویل سوچ بچار کے بعد دنیا کا منظر نامہ دیکھ کر میں نے یہ مضمون آپ پیاروں کے لیے لکھا ہے۔ اس میں نے افینس نہیں ڈیفنس کی بات کی ہے کہیں یہ تاثر نہ لیجئے کہ میں کسی زیادتی جنگ یا فساد کی بات کر رہا ہوں۔ ہمارے ہاں ایک بڑا مسئلہ یہ ہے کہ مثبت بات کے بعد غلط معنی لینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ خیر۔ ہم جس دنیا میں جی رہے ہیں اس میں دفاع ایک بہت بڑا محاذ ہے۔ ہمیں اس میدان میں بھی اپنی نسلوں کو تیار کرنا ہو گا۔

اپنی نسلوں کو صرف کتاب نہ دو، انہیں ہنر دو، ہر ماں کا بیٹا اگر علم کا عالم اور دفاع کا ماہر ہو، تو قوم ناقابلِ تسخیر ہو جاتی ہے۔ دفاع صرف فوج کا کام نہیں، ہر فرد کو اپنی حفاظت کے ہنر سیکھنے چاہییں۔ نسلوں کو دفاعی تربیت دینا ایسا ہی ہے جیسے انہیں زندہ رہنے کا اصل راز سکھانا۔ نسلوں کو جسمانی، ذہنی اور اخلاقی دفاع کے ہنر سکھانا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری نسل غلام نہ بنے، تو اُسے آج ہی سے محافظ بناؤ۔ اللہ پاک ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔

وحید الدین خان

تربیتِ اولاد (پارٹ-5)

اولاد پرستی کا فتنہ

ایک حدیثِ رسول میں بتایا گیا ہے کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ شرمندہ وہ شخص ہوگا جو دوسرے کی دنیا کے لیے اپنی آخرت کو بیچ دے (إِنَّ أَشَدَّ النَّاسِ نَدَامَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ رَجُلٌ بَاعَ آخِرَتَهُ بِدُنْيَا غَيْرِهِ)التاریخ الکبیر للبخاری، حدیث نمبر 1927۔ یہ حدیث موجودہ زمانے میں سب سے زیادہ اُن لوگوں پر چسپاں (apply) ہوتی ہے جو صاحب اولاد ہیں۔ موجودہ زمانے میں صاحب اولاد لوگوں کا حال یہ ہے کہ ہر ایک کے لیے اس کی اولاد اُس کا سپریم کنسرن بنی ہوئی ہے۔ ہر ایک کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی اولاد کے لیے زیادہ سے زیادہ دنیا کمانے میں مصروف ہے، اور خود اپنی آخرت کی خاطر کوئی حقیقی کام کرنے کے لیے آدمی کے پاس وقت ہی نہیں۔

موجودہ زمانے میں ہر آدمی اِس حقیقت کو بھول گیا ہے کہ اس کی اولاد اُس کے لیے صرف امتحان کا پرچہ (الانفال، 8:28) ہے۔ اولاد اس کو اِس لیے نہیں ملی ہے کہ وہ بس اپنی اولاد کو خوش کرتا رہے، وہ اپنی اولاد کی دنیوی کامیابی کے لیے اپنی ساری توانائی لگادے۔

موجودہ زمانے میں بہت سے لوگ ہیں جو بظاہر مذہبی وضع قطع بنائے رہتے ہیں اور رسمی معنوں میں صوم و صلاۃ کی پابندی بھی کرتے ہیں، لیکن عملًا وہ اپنا سارا وقت اور اپنی بہترین صلاحیت صرف دنیا کمانے میں لگائے رہتے ہیں، صرف اِس لیے کہ جب وہ مریں تو اپنی اولاد کے لیے وہ زیادہ سے زیادہ سامانِ دنیا چھوڑ کر جائیں۔

مگر ایسے لوگ صرف اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ خدا کو دینے کے لیے اُن کے پاس صرف کچھ ظاہری رسوم ہیں اور جہاں تک حقیقی زندگی کا تعلق ہے، اس کو انھوں نے صرف اپنی اولاد کے لیے وقف کرر کھا ہے۔ یہ خدا پرستی نہیں ہے بلکہ وہ اولاد پرستی ہے، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ اولاد پرستی کا طریقہ کسی کو خدا پرستی کا کریڈٹ نہیں دے سکتا۔ خدا پرستی، زندگی کا ضمیمہ (appendix) نہیں، حقیقی خدا پرستی وہ ہے جو انسان کی پوری زندگی کا اِحاطہ کیے ہوئے ہو۔

خوش فکری، یا حقیقت پسندی

ایک باپ کو اپنے بیٹے سے بہت تعلق تھا۔ باپ کے ذہن میں کام کا ایک آئڈیل تصور تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو اُس آئڈیل کام کے لیے تیار کرے۔ اِس مقصد کے لیے اُس نے اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔ اُس کی امیدیں تمام تر اپنے بیٹے سے وابستہ ہو گئیں۔ جب بیٹا بڑا ہو گیا اور اس کی تعلیم مکمل ہو گئی تو باپ نے چاہا کہ اس کا بیٹا اس کے پسندیدہ کام میں لگے۔ لیکن بیٹے نے انکار کر دیا۔ باپ نے بہت کچھ کہا، لیکن بیٹے کی سمجھ میں نہ آیا۔ بیٹے نے آخری طور پر اپنے باپ سے کہہ دیا — بیٹا جب بڑا ہو جاتا ہے تو وہ خود اپنی عقل سے کام کرتا ہے۔

بیٹے کا یہ جواب سُن کر باپ کو اتنی مایوسی ہوئی کہ وہ نفسیاتی مریض بن گیا۔ اس کا بلڈ پریشر بڑھ گیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اِس معاملے میں باپ کی غلطی تھی، نہ کہ بیٹے کی غلطی۔ یہ ایک فطری حقیقت ہے کہ ہر بچہ عقل و شعور لے کر پیدا ہوتا ہے۔ چھوٹی عمر میں جب وہ ناپختہ (immature) ہوتا ہے، اُس وقت وہ باپ اور ماں کی بات کو سنتا ہے۔ لیکن جب وہ بڑا ہوتا ہے تو اس کا شعور پختہ ہو چکا ہوتا ہے۔ اُس کے اندر خود فکری (self-thinking) کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی عقل سے آزادانہ فیصلہ کرنے لگتا ہے۔ ایسی حالت میں مذکورہ قسم کے والدین کی سوچ غیر فطری ہے، وہ کبھی واقعہ بننے والی نہیں۔

والدین کو چوں کہ اپنے بیٹے سے بہت زیادہ محبت ہوتی ہے۔ محبت کے جذبے کے تحت، وہ اپنے بیٹے کے بارے میں خوش فکر (wishful) بن جاتے ہیں۔ وہ اپنے بیٹے سے ایسی امیدیں قائم کر لیتے ہیں جو قانونِ فطرت کے خلاف ہوتی ہے۔ اِس خوش فکری (wishful thinking) میں تقریباً ہر باپ مبتلا رہتا ہے۔ اِس قسم کی خوش فکری اِس دنیا میں کبھی واقعہ بننے والی نہیں۔ والدین کو چاہیے کہ وہ حقیقت پسند بنیں، تاکہ وہ اپنی اولاد کے بارے میں مایوسی کا شکار نہ ہوں۔

بچوں کا دکھ جھیل رہے ہیں

ایک سینئر مسلم تاجر سے ایک صاحب نے پوچھا کہ آپ کو خدا نے 95 سال کی عمر دی، یعنی تقریباً ایک صدی۔ اِس لمبی زندگی میں آپ نے کیا سیکھا اور کیا تجربہ کیا۔ اِس سوال کے بعد وہ دو منٹ چپ رہے۔ اس کے بعد انھوں نے نہایت سنجیدہ انداز میں کہا— کوئی تجربہ نہیں۔ بس پیدا ہوئے۔ بڑے ہوئے تو بزنس میں لگ گئے۔ شادی کی اور بچے پیدا کیے۔ بچوں کو سیٹل (settle) کیا۔ اب آخر عمر میں بچوں کا دکھ جھیل رہے ہیں، اور موت کا انتظار کر رہے ہیں۔

موجودہ زمانے میں یہی ہر گھر کی کہانی ہے۔ موجودہ زمانے میں تقریباً ہر ماں باپ کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اپنی تمام محبتوں کا مرکز بناتے ہیں۔ بچوں کی زندگی سنوارنے کے لیے وہ سب کچھ کر ڈالتے ہیں، مگر آخر میں ہر ایک کا یہ حال ہوتا ہے کہ بچے غیر وفادار نکلتے ہیں۔ وہ اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر اپنی آزاد زندگی بنا لیتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں ماں باپ کی خدمت ایک فرسودہ تصور بن چکا ہے۔ بچوں کی ترقی کو ماں باپ اِس حسرت کے ساتھ دیکھتے رہتے ہیں کہ جس پیڑ کو ہم نے محنت کر کے اگایا تھا، اُس پیڑ کا سایہ اُنھیں حاصل نہیں ہوا۔

حدیث میں آیا ہے کہ ایک زمانہ آئے گا، جب کہ بچے اپنے دوست کے ساتھ حسن سلوک کریں گے، اور اپنے ماں باپ کے ساتھ بد سلوکی کریں گے (بَرَّ صَدِيقَهُ، وَجَفَا أَبَاهُ) سنن الترمذی، حدیث نمبر 2210۔ یہ حدیثِ رسول، موجودہ زمانے پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ آج ساری دنیا میں عمومی طور پر ایسا ہی ہو رہا ہے۔ اِس واقعے کا سب سے زیادہ بُرا حصہ اُن لوگوں کو مل رہا ہے جو ساری زندگی بچوں کو خوش کرنے میں لگے رہتے ہیں، اور آخر میں ان کے حصے میں غم کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔ مزید یہ کہ ایسے ماں باپ اُس حدیث کا مصداق ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ سب سے زیادہ گھاٹے میں وہ شخص ہے جو دوسروں کی دنیا بنانے کے لیے اپنی آخرت کو کھودے (أَذْهَبَ آخِرَتَهُ بِدُنْيَا غَيْرِهِ) سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 3966۔

اہل وعیال کا فتنہ

حدیث کی کتابوں یں اہل وعیال کے بارے میں بہت سی روایتیں آئی ہیں۔ اُن میں سے دو روایتیں یہاں نقل کی جاتی ہیں:

حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: الْوَيْلُ كُلُّ الْوَيْلِ لِمَنْ تَرَكَ عِيَالَهُ بِخَيْرٍ وَقَدِمَ عَلَى رَبِّهِ بِشَرٍّ (مسند الشہاب القضاعی، حدیث نمبر 314)۔ یعنی کامل تباہی وبربادی ہے اُس شخص کے لیے جس نے اپنے عیال کو اچھی حالت میں چھوڑا، اور خود برے حال میں اپنے رب کے پاس پہنچا۔ دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: يُؤْتَى بِرَجُل يَوْم الْقِيَامَة فَيُقَال أكل عِيَاله حَسَنَاته (تخریج الأحادیث فی تفسیر الکشاف للزیلعی، حدیث نمبر 1357)۔ یعنی قیامت کے دن ایک شخص لایا جائے گا اور کہا جائے گا کہ اس کے اہل وعیال اس کی نیکیاں کھاگئے۔

قدیم زمانے میں صرف کچھ افراد اِس قسم کے ہوتے تھے، لیکن موجودہ زمانے میں اِس پہلو سے بگاڑ کا یہ حال ہے کہ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تمام لوگ اِس تباہ کن کمزوری کا شکار ہوگئے ہیں۔ اِس کمزوری کا سبب حبّ ِعیال ہے۔ بظاہر لوگ خدا کا اور اسلام کا نام لیتے ہیں، لیکن اُن کی محبتیں صرف اپنے اہل وعیال سے ہوتی ہیں۔ لوگوں کا حال یہ ہے کہ اُن کا سب سے بڑا کنسرن اُن کے اہل وعیال ہوتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اور اپنے مال واسباب کو اپنے اہل وعیال کے لیے وقف کیے رہتے ہیں۔ موت ایسے لوگوں کے لیے ایک جبری انقطاع (compulsive detachment) کے طور پر آتی ہے۔ ایسے لوگ جب موت کے بعد خدا کے پاس پہنچتے ہیں تو وہاں کے لیے اُن کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔ یہ بلاشبہ سب سے بڑی محرومی ہے۔ حدیث کے مطابق، یہ دوسروں کی دنیا بنانے کے لیے اپنی آخرت کو تباہ کرنا ہے (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 3966)۔ مزید یہ کہ یہ اہل وعیال جن کو آدمی اپنا سب کچھ دے دیتا ہے، وہ موت کے بعد اُس سے اِس طرح جدا ہوجاتے ہیں کہ دوبارہ وہ اُس کو کبھی نہیں ملتے۔

پرچۂ امتحان

یوپی کے ایک مسلمان دہلی میں آکر آباد ہوئے۔ انھوں نے پراپرٹی کا بزنس کیا۔ انھوں نے اِس بزنس میں کافی دولت کمائی۔ مگر اُن کے یہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ ایک بار ان کی ماں دہلی آئیں۔ انھوں نے دیکھا کہ ان کا بیٹا دہلی میں ایک بڑے گھر میں رہتا ہے۔ دنیا کی ہر چیز اس کے پاس ہے، مگر شادی کو کافی عرصہ گزرنے کے باوجود اُن کے یہاں اولاد نہیں ہوئی۔ اُن کی ماں اِس بات پر کافی پریشان ہوئیں۔ وہ اکثر کہتی تھیں —ہائے میرے بیٹے کی دولت کون لے گا۔

اِس واقعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن میں اولاد کو فتنہ کیوں کہا گیا ہے (64:15)۔ اس کا سبب یہ ہے کہ لوگ اپنے بیٹے کو اپنی ذات کی توسیع (extension) سمجھتے ہیں۔ اُن کو یقین ہوتا ہے کہ اُن کی کمائی ان کے بعد ضائع نہیں ہوگی، بلکہ اپنے بیٹے کی صورت میں بالواسطہ طور پر وہ اُن کو حاصل رہے گی۔

اولاد کے بارے میں اِسی تصور کی بنا پر لوگوں کے لیے اولاد ایک فتنہ بن جاتی ہے۔ اِس تصور کے تحت جو ذہن بنتا ہے، اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ آدمی موت کی سنگینی سے غافل ہو جاتا ہے۔ موت کے بعد کے احوال پر وہ زیادہ سنجیدگی کے ساتھ نہیں سوچتا۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر وہ موت اور موت کے بعد کی حقیقتوں کے معاملے سے بے خبر ہو جاتا ہے۔

اولاد کی اصل اہمیت یہ ہے کہ اُس کے ذریعے نسلِ انسانی کا بقا و تسلسل جاری رہتا ہے۔ جہاں تک دولت کی بات ہے، وہ باپ کے لیے بھی امتحان کا ایک پرچہ ہے، اور بیٹے کے لیے بھی امتحان کا ایک پرچہ۔ دولت کو اگر اِس ذہن کے تحت دیکھا جائے تو دولت کبھی مسئلہ نہ بنے۔ اس حقیقت کو ایک حدیث رسول میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ کسی والدین کی طرف سے اپنی اولاد کے لیے بہترین تحفہ یہ ہے کہ وہ تعلیم و تربیت کے ذریعے اس کو اچھا انسان بنائے۔ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 1952)

ہاتھی کی دم میں پتنگ

اکثر والدین مجھ سے پوچھتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں بچوں کی دینی تربیت کے لیے کیا کیا جائے۔ میرا جواب ہمیشہ ایک رہتا ہے—بچوں کی تربیت سے پہلے خود اپنی تربیت کیجیے۔ موجودہ زمانے میں بچوں کے بگاڑ کا اصل سبب خارجی ماحول نہیں ہے، بلکہ گھر کا داخلی ماحول ہے۔ گھر کا داخلی ماحول کون بناتا ہے، یہ والدین ہیں جو گھر کا داخلی ماحول بناتے ہیں۔ جب تک گھر کے داخلی ماحول کو حقیقی معنوں میں دینی، یعنی آخرت پسندانہ ماحول نہ بنایا جائے، بچوں کے اندر کوئی اصلاح نہیں ہو سکتی۔

موجودہ زمانے کا اصل فتنہ مال ہے۔ آج کل ہر آدمی زیادہ سے زیادہ مال کمار رہا ہے۔ اِس مال کا مصرف والدین کے نزدیک صرف ایک ہے، اور وہ ہے گھر کے اندر ہر قسم کی راحت کے سامان اکھٹا کرنا، اور بچوں کی تمام مادّی خواہشوں کو پورا کرنا۔ موجودہ زمانے میں یہ کلچر اتنا زیادہ عام ہے کہ اِس معاملے میں شاید کسی گھر کا کوئی استثنا نہیں، خواہ وہ بے ریش والوں کا گھر ہو، یا باریش والوں کا گھر۔ والدین کے اِس مزاج نے ہر گھر کو مادّہ پرستی کا کارخانہ بنا دیا ہے۔ تمام والدین اپنے بچوں کے اندر شعوری یا غیر شعوری طور پر مادّہ پرستانہ ذہن بنانے کے امام بنے ہوئے ہیں۔ اِسی کے ساتھ تمام والدین یہ چاہتے ہیں کہ اُن کے بچے آخرت کی جنت سے بھی محروم نہ رہیں۔ اِسی مزاج کے بارے میں ایک اردو شاعر نے کہا تھا— رِند کے رِند رہے، ہاتھ سے جنت نہ گئی۔

مگر یہ صرف ایک خوش خیالی ہے جو کبھی واقعہ بننے والی نہیں۔ تمثیل کی زبان میں یہ ''ہاتھی کی دم میں پتنگ باندھنا'' ہے۔ موجودہ زمانے کے والدین ایک طرف، اپنے بچوں کو ''مادّی ہاتھی'' بناتے ہیں۔ دوسری طرف، وہ چاہتے ہیں کہ اِس ہاتھی کی دم میں دین کی پتنگ باندھ دی جائے۔ مگر ایسی پتنگ کا حال صرف یہ ہونے والا ہے کہ ہاتھی ایک بار اپنی دم کو جھٹکا دے اور یہ پتنگ اُڑ کر بہت دور چلی جائے۔ والدین کو چاہیے کہ اگر وہ اپنے بچوں کو دین دار، یعنی آخرت پسند بنانا چاہتے ہیں تو وہ اُس کی قیمت ادا کریں، ورنہ وہ فرضی طور پر اِس قسم کی منافقانہ بات کرنا بھی چھوڑ دیں۔

ہر گھر بگاڑ کا کارخانہ

آج کل عام طورپر یہ حال ہے کہ ہر گھر میں ایک طرف اپنے بچوں اور اپنے خاندان والوں کی تعریف کی جاتی ہے، اُن کا ذکر ہمیشہ مثبت انداز میں کیا جاتا ہے۔ اِس کے برعکس، جب بھی دوسروں کا چرچا کیا جاتا ہے تو وہ تنقیص کے انداز میں ہوتا ہے۔

اپنوں کے بارے میں مثبت باتوں کا چرچا اور دوسروں کے بارے میں منفی باتوں کا چرچا، یہ کلچر اتنا زیادہ عام ہے کہ شاید ہی کوئی گھر اِس سے خالی ہو۔

گھر کے اندر سماج کے شہری بنتے ہیں، لیکن مذکورہ کلچر نے گھر کو اِس قابل نہیں رکھا ہے کہ وہ اپنے سماج کے لیے اچھے شہری سپلائی کرے۔ ہر گھر میں ایسے عورت اور ایسے مرد بن کر تیار ہورہے ہیں جو اپنوں کے بارے میں مثبت رائے اور دوسروں کے بارے میں منفی رائے رکھتے ہیں، جن کو اپنوں سے محبت ہے اور دوسروں سے نفرت، جو اپنوں کے بارے میں رواداد (tolerant) ہیں اور دوسروں کے بارے میں وہ غیر رواداد (intolerant) بنے ہوئے ہیں، جن کے اندر اپنوں کو دینے کا ذہن ہے اور دوسروں سے صرف لینے کا ذہن، جو اپنوں کو برتر سمجھتے ہیں اور دوسروں کو کم تر، جو اپنوں کی ترقی پر خوش ہوتے ہیں اور دوسروں کی ترقی دیکھ کر اُنھیں کوئی خوشی نہیں ہوتی، جو اپنوں کی تکلیف سے فکر مند ہوتے ہیں اور دوسروں کی تکلیف کو دیکھ کر انھیں کوئی فکر مندی لاحق نہیں ہوتی، وغیرہ۔

اِس صورتِ حال کا یہ نتیجہ ہے کہ اب سماجی اقدار (social values) کا تصور ختم ہو گیا ہے۔ اب ایک ہی چیز ہے جو ہر ایک کا واحد کنسرن (sole concern) بنی ہوئی ہے، اور وہ ہے ذاتی مفاد (self-interest)۔ اِس صورتِ حال نے ہر ایک کو خود غرض اور استحصال پسند بنا دیا ہے، کسی کو کم اور کسی کو زیادہ۔ یہ صورتِ حال بے حد سنگین ہے۔ اِس کی اصلاح جلسوں اور تقریروں کے ذریعے نہیں ہوسکتی، اس کی اصلاح کا طریقہ صرف یہ ہے کہ گھر والے اپنے گھر کے ماحول کو درست کریں۔ گھر کے ماحول کو درست کیے بغیر اِس سنگین صورتِ حال کی اصلاح ممکن نہیں۔

بچوں کا قبرستان

ایک تعلیم یافتہ مسلمان ہمارے مشن سے جڑے ہوئے تھے۔ اُس وقت ان کے یہاں اولاد نہیں تھی، پھر ان کے یہاں بچے پیدا ہوئے۔ اِس کے بعد وہ دھیرے دھیرے مشن سے دور ہوگئے۔ ایک عرصے کے بعد ان سے ملاقات ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے دعوتی کام کو کیوں چھوڑ دیا۔ انھوں نے کہا— بچوں کی ذمے داریاں اتنی بڑھ گئی ہیں کہ اب وقت نہیں ملتا۔

موجودہ زمانے میں یہی کم و بیش ہر آدمی کا حال ہے۔ لوگوں کے لیے ان کے بچے ان کا قبرستان بنے ہوئے ہیں۔ ہر آدمی کے لیے اس کے بچے اس کا واحد کنسر نہیں۔ ہر آدمی اپنا پیسہ، اپنا وقت، اپنی انرجی، غرض جو کچھ اس کے پاس ہے، وہ اس کو اپنے بچوں کے لیے وقف کیے ہوئے ہے۔ دوسروں کے لیے اس کے پاس صرف زبانی ہمدردی (lip service) ہوتی

ہے، اور اپنی اولاد کے لیے حقیقی عمل، حتی کہ خدا کے لیے یا خدائی کام کے لیے بھی اس کے پاس صرف الفاظ ہوتے ہیں، اِس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

آج جس شخص سے ملاقات کیجیے، وہ اپنے بچوں کے لیے فکر مند ہو گا، لیکن وہ خود اپنے مستقبل کے لیے فکر مند دکھائی نہ دے گا۔ یہ عین وہی صورتِ حال ہے جس کو حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ دوسرے کی دنیا بنانے کے لیے اپنی آخرت کو کھو دینا (سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر 3966)۔ اِس معاملے کا سب سے زیادہ اندوہناک پہلو یہ ہے کہ لوگ محبتِ اولاد میں اتنا زیادہ غرق ہیں کہ وہ اِس حدیثِ رسول کا مصداق بن گئے ہیں: حُبُّكَ الشَّيْءَ يُعْمِي وَيُصِمُّ (سنن ابو داؤد، حدیث نمبر 5130)۔ یعنی کسی چیز سے تمہاری محبت تم کو اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے۔ اولاد کی محبت ان پر اتنا زیادہ غالب ہے کہ وہ یہ بھی سوچ نہیں پاتے کہ ہم اولاد کے مستقبل کو بنانے کی فکر میں خود اپنے مستقبل کو تباہ کر رہے ہیں۔ اِس بنا پر لوگوں کا حال یہ ہے کہ ان کے پاس زیادہ اہم کاموں کے لیے وقت نہیں۔ مثلاً دینی مطالعہ، دعوہ ورک، آخرت کو سامنے رکھ کر اپنے معاملات کی منصوبہ بندی، وغیرہ۔

نظر کی خریداری

ایک صاحب مجھ کو اپنے گھر لے گئے۔ میں نے دیکھا کہ ان کا گھر مختلف قسم کے سامانوں سے بھرا ہوا ہے۔ پورا گھر ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور (departmental store) معلوم ہوتا تھا۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے گھر میں اتنا زیادہ سامان کیوں ہے۔ انھوں نے کہا کہ جب میں بازار جاتا ہوں اور وہاں میں کسی چیز کو دیکھتا ہوں، وہ مجھ کو پسند آجاتی ہے تو میں اس کو خرید لیتا ہوں۔ یہ نظر کی خریداری ہے۔ اکثر لوگوں کا حال یہی ہے کہ وہ چیزوں کو دیکھ کر خریدتے ہیں، خواہ وہ ان کے استعمال میں آنے والی ہوں یا نہ ہوں۔

خریداری کی دو قسمیں ہیں— نظر کی خریداری اور ضرورت کی خریداری۔ نظر کی خریداری وہ ہے جو دیکھ کر کی جائے۔ اس کے برعکس، ضرورت کی خریداری یہ ہے کہ آپ کو ایک چیز کی ضرورت ہو، اس کو حاصل کرنے کے ارادے سے آپ گھر سے نکلیں اور جہاں وہ چیز ملتی ہو، وہاں جاکر اس کو خرید لیں۔

نظر کی خریداری دوسرے الفاظ میں بے مقصد خریداری ہے۔ وہ اپنے وقت اور اپنے مال کو ضائع کرنے کے ہم معنی ہے۔ یہ وہی چیز ہے جس کو قرآن میں مال کی تبذیر (17:26) بتایا گیا ہے۔ یعنی مال کو بلاضرورت بکھیرنا۔ ضرورت کی خریداری ایک ذمہ دارانہ فعل ہے، اور نظر کی خریداری ایک غیر ذمہ دارانہ فعل۔

کسی مرد یا عورت کے پاس جو مال ہے، وہ اللہ کا دیا ہوا ہے، وہ اللہ کی ایک امانت ہے۔ جو عورت یا مرد مال کو مسرفانہ طور پر خرچ کریں، وہ خدا کی دی ہوئی امانت میں خیانت کرتے ہیں۔ وہ ایک ایسا کام کرتے ہیں، جس کے لیے آخرت میں ان کی سخت پکڑ ہوگی۔ مال کو جائز ضرورت پر خرچ کرنا ثواب کا کام ہے۔ اس کے برعکس، اگر مال کو غیر ضروری مدوں میں خرچ کیا جائے تو وہ خرچ کرنے والے کے لیے ایک گناہ بن جاتا ہے۔ مال کو خرچ کرنے کے معاملے میں انسان کو بہت زیادہ محتاط ہونا چاہیے۔

پیمپرنگ کا نقصان

میرے والد فرید الدین خاں کا انتقال دسمبر 1929ء میں ہوا۔ اُس وقت میری عمر تقریباً 6 سال تھی۔ میرے والد اپنے تمام بچوں میں مجھ کو سب سے زیادہ مانتے تھے۔ وہ میرے ساتھ لاڈپیار (pampering) کا معاملہ کرتے تھے۔ اِس بنا پر میں بہت شوخ ہو گیا تھا اور اکثر طفلانہ شرارتیں کیا کرتا تھا۔ شیخ محمد کامل میرے پھوپھا تھے۔ وہ اِس کو دیکھ کر غصہ ہوتے تھے۔ وہ میرے والد سے کہتے تھے کہ — تم اپنے بیٹے کو خراب کر ڈالو گے۔

لیکن بچپن میں میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ میری والدہ زیب النساء (وفات 1985ء) بتاتی تھیں کہ والد کی زندگی میں میں بہت بولتا تھا، لیکن جب والد کا انتقال ہو گیا تو اچانک میں بالکل بدل گیا۔ میری شوخیاں ختم ہو گئیں۔ اب میں خاموش رہنے لگا۔ یہ میری زندگی کا بہت بڑا واقعہ تھا۔ اگر میرے باپ زیادہ دن تک زندہ رہتے تو یقینی طور پر میں اُسی قسم کا ایک نوجوان بن جاتا جس کو لاڈپیار سے بگڑا ہوا بچہ (spoilt and pampered child) کہا جاتا ہے۔ بعد کو میری زندگی میں جو حقیقت پسندی اور سنجیدگی آئی، وہ براہِ راست طور پر میری یتیمی کا نتیجہ تھی۔

ایک انسان جب پیدا ہوتا ہے تو ابتدائی طور پر وہ اپنے والدین کے ساتھ ہوتا ہے۔ لیکن یہ مدت عارضی ہوتی ہے۔ اس کو اپنی بقیہ زندگی والدین کے ماحول سے باہر، دوسروں کے درمیان گزارنی پڑتی ہے۔ والدین اپنے بچوں کے ساتھ لاڈپیار کا معاملہ کرتے ہیں۔

اِس لاڈپیار کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچہ شعوری یا غیر شعوری طور پر سمجھ لیتا ہے کہ مجھ سے محبت کرنے والا وہی ہے جو میرے ساتھ لاڈپیار (pampering) کا معاملہ کرے۔ لیکن یہ بچہ جب اپنے گھر سے باہر آتا ہے تو دوسرے لوگوں سے اس کو والدین والا لاڈپیار نہیں ملتا۔ اب وہ ساری دنیا سے بے زار ہو جاتا ہے۔ اِس صورتِ حال نے تمام عورتوں اور مردوں کو شکایت کی نفسیات میں مبتلا کر دیا ہے، جب کہ صحیح یہ تھا کہ لوگوں کے اندر دوسرے انسانوں کے لیے محبت کی نفسیات پیدا ہو۔

تربیت اولاد

حدیث کی مختلف کتابوں میں ایک روایت آئی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: باپ کی طرف سے اپنے بیٹے کے لیے اس سے بہتر کوئی عطیہ نہیں کہ وہ اس کو اچھے آداب سکھائے: مَا نَحَلَ وَالِدٌ وَلَدًا مِنْ نَحْلٍ أَفْضَلَ مِنْ أَدَبٍ حَسَنٍ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 1952)۔ اس حدیث میں بظاہر صرف والد کا ذکر ہے، مگر تبعاً اُس سے مراد والد اور والدہ دونوں ہیں۔ نیز ادب کا لفظ یہاں تعلیم وتربیت کے تمام پہلوؤں کے لیے جامع ہے، خواہ وہ مذہبی نوعیت کی چیزیں ہوں یا دنیاوی نوعیت کی چیزیں۔

عورت اور مرد کو فطری طور پر اپنی اولاد سے غیر معمولی محبت ہوتی ہے۔ اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ اس محبت کا بہترین استعمال کیا ہے یا کیا ہونا چاہیے۔ وہ استعمال یہ ہے کہ والدین اپنے بچوں کو آدابِ زندگی سکھائیں۔ وہ اپنے بچوں کو بہتر

انسان بنا کر دنیا کے کارزار میں داخل کریں۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ والدین اپنی محبت کا استعمال زیادہ تر اس طرح کرتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں کی ہر خواہش پوری کرنے میں لگے رہتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ بچہ جو چاہے وہ اس کے لیے حاضر کر دیا جائے، یہی بچہ کے لیے محبت کا سب سے زیادہ بڑا استعمال ہے، مگر یہ بچوں کے حق میں خیر خواہی نہیں۔

چھوٹا بچہ اپنی خواہشوں کے سوا کچھ اور نہیں جانتا۔ اس کی سوچ بس یہ ہوتی ہے کہ اس کے دل میں جو خواہش آئے وہ فوراً پوری ہو جائے۔ مگر یہ طفلانہ سوچ ہے۔ کیونکہ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ بچہ ایک دن بڑا ہوگا۔ وہ بڑا ہو کر دنیا کے میدان میں داخل ہوگا۔ زندگی کے اس اگلے مرحلہ میں کامیاب ہونے کے لیے بچہ کو جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ کہ وہ آدابِ حیات سے مسلّح ہو کر وہاں پہنچا ہو۔ بچہ جب بالکل چھوٹا ہو اسی وقت سے اس کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع کر دینا چاہیے تاکہ یہ چیزیں عادت بن کر اس کی زندگی میں داخل ہو جائیں۔ زندگی کے ان آداب کے تین خاص پہلو ہیں: دین، اخلاق اور ڈسپلن۔

دین کے اعتبار سے بچہ کی تربیت کا آغاز پیدائش کے فوراً بعد ہو جاتا ہے جب کہ اس کے کان میں اذان کی آواز داخل کی جاتی ہے۔ یہ علامتی انداز میں اس بات کا اظہار ہے کہ بچہ کو دین دار بنانے کا عمل آغازِ عمر ہی سے شروع کر دینا ہے۔ یہ کام ماں اور باپ دونوں کو کرنا ہے۔

والدین کی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ بچہ کے اندر توحید اور اسلامی عقائد خوب پختہ ہو جائیں۔ ذکر اور عبادت اس کی زندگی کے لازمی اجزاء بن کر اس کی شخصیت میں شامل ہو جائیں۔ وہ نماز، روزہ کا پابند ہو۔ صدقہ اور خیرات کا شوق اس کے اندر پیدا ہو جائے۔ قرآن اور حدیث سے اس کو اس قدر شغف ہو جائے کہ وہ روزانہ اس کا کچھ نہ کچھ حصہ مطالعہ کرنے لگے۔ اس کو دیکھ کر ہر آدمی یہ کہہ دے کہ یہ بچہ ایک دین دار بچہ ہے۔

اخلاق کی تربیت کی صورت یہ ہے کہ ہر موقع پر بچہ کو سکھایا جائے۔ اگر وہ غلطی کرے تو اس کو ٹوکا جائے۔ حتیٰ کہ اگر ضرورت ہو تو اس کی تنبیہ کی جائے۔ بھائی بہنوں میں لڑائی ہو تو فوراً سمجھایا جائے۔ اگر کبھی بچہ جھوٹ بولے یا کسی کو گالی دے۔ یا کسی کی چیز چرا لے تو نہایت سختی کے ساتھ اس کا نوٹس لیا جائے۔ اور یہ سب بالکل بچپن سے کیا جائے تاکہ بچہ کو زندگی میں یہ چیزیں مستقل کردار کے طور پر شامل ہو جائیں۔

یہی طریقہ ڈسپلن کے بارے میں اختیار کرنا ہے۔ بچہ کو اوقات کی پابندی سکھائی جائے۔ چیزوں کو صحیح جگہ رکھنے کی عادت ڈالی جائے۔ کھانا پینا باقاعدہ وقت کے ساتھ ہو۔ اگر وہ کوئی کاغذ یا تھیلی سڑک پر پھینک دے تو فوراً اسی سے اس کو اٹھوایا جائے۔ شور کرنے سے روکا جائے، ہر ایسی چیز سے بچنے کی تلقین کی جائے جس سے دوسروں کو تکلیف پہنچتی ہو۔

بچہ کی حقیقی تربیت کے لیے خود ماں باپ کو اپنا طرزِ زندگی اس کے مطابق بنانا ہوگا۔ اگر آپ اپنے بچہ سے کہیں کہ جھوٹ نہ بولو، اسی کے ساتھ آپ یہ کریں کہ جب کوئی شخص دروازہ پر دستک دے تو کہلوا دیں کہ وہ اس وقت گھر پر نہیں ہیں تو ایسی حالت میں بچہ کو جھوٹ سے روکنا بے معنی ہوگا۔ اگر آپ سگریٹ پیتے ہوں تو بچہ کے سامنے اسموکنگ کے خلاف تقریر کرنا بے معنی ہے۔ اگر آپ وعدہ پورا نہ کرتے ہوں اور بچہ سے کہیں کہ بیٹے، ہمیشہ وعدہ پورا کرو، تو کبھی ایسی نصیحت کو نہیں پکڑے گا۔

بچہ اپنے والدین کو ماڈل کے روپ میں دیکھتا ہے۔ اسی طرح بڑا بچہ چھوٹے بچوں کے لیے ماڈل ہوتا ہے۔ اگر والدین اور بڑا بچہ ٹھیک ہو تو بقیہ بچے اپنے آپ سدھرتے چلے جائیں گے۔

اخلاقی زہر

6 جنوری 1990ء کو دہلی (شکرپور) میں ایک دردناک واقعہ ہوا۔ کچھ چھوٹے بچے ایک میدان میں کھیل رہے تھے۔ وہاں ایک طرف کوڑے کا ڈھیر تھا۔ وہ کھیلتے ہوئے اس کوڑے تک پہنچ گئے۔ یہاں انھیں ایک پڑی ہوئی چیز ملی۔ یہ کوئی زہریلی چیز تھی۔ مگر انھوں نے بے خبری میں اس کو اٹھا کر کھالیا۔ اس کے نتیجہ میں دو بچے فوراً ہی مر گئے، اور آٹھ بچوں کو تشویشناک حالت میں جے پرکاش نرائن اسپتال میں داخل کرنا پڑا۔ یہ بچے دو سال سے پانچ سال تک کے تھے۔

ٹائمس آف انڈیا (7 جنوری 1990ء) نے صفحہ اول پر اس کی خبر دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ان بچوں میں سے ایک نے وہاں ایک چھوٹا پیکٹ پایا۔ اس میں تقریباً ڈیڑھ سو گرام کوئی سفید رنگ کا سفوف تھا۔ انھوں نے غلطی سے اس کو شکر سمجھا اور آپس میں تقسیم کر کے کھانے لگے۔ کھانے کے چند منٹ بعد ان کے ہونٹ نیلے پڑ گئے:

> "One of them found a small packet containing about 150 gm of white, powdery substance. They mistook it for sugar and distributed it among themselves. Within minutes of consuming it, their lips turned blue."

مادی خوراک کے اعتبار سے یہ چند بچوں کا واقعہ ہے۔ لیکن اخلاقی خوراک کے اعتبار سے دیکھئے تو آج یہی تمام انسانوں کا واقعہ ہے۔ آج کی دنیا میں تمام انسان ایسی اخلاقی غذائیں کھا رہے ہیں جو ان کی انسانیت کے لیے زہر ہیں، جو ان کو ابدی ہلاکت سے دوچار کرنے والی ہیں۔

جھوٹ، بدکاری، رشوت، غرور، حسد، الزام تراشی، ظلم، غصب، بد دیانتی، وعدہ خلافی، بدخواہی، بے اصولی، بد معاملگی، انانیت، بے اعترافی، غلطی نہ ماننا، احسان فراموشی، خود غرضی، انتقام، اشتعال انگیزی، اپنے لیے ایک چیز پسند کرنا اور دوسرے کے لیے کچھ اور پسند کرنا، یہ تمام چیزیں اخلاقی معنوں میں زہریلی غذائیں ہیں۔ آج تمام لوگ ان چیزوں کو میٹھی شکر سمجھ کر کھا رہے ہیں۔ مگر وہ وقت زیادہ دور نہیں جب ان کا زہریلا پن ظاہر ہوگا۔ اور پھر انسان اپنے آپ کو اس حال میں پائے گا کہ وہاں نہ کوئی اس کی فریاد سننے والا ہوگا اور نہ کوئی اس کا علاج کرنے والا۔

ایک مثال

ریڈیو میں ایک پروگرام آتا ہے جو صرف عورتوں کے لیے ہوتا ہے۔ اِس میں عورتوں سے متعلق مختلف عنوانات دیے جاتے ہیں۔ اِسی پروگرام کے تحت، ایک دن ماں اور اس کے بچوں کے درمیان تعلقات کا موضوع زیر بحث تھا۔ کئی ماؤں نے اِس پہلو سے اپنے تجربات کو بیان کیا۔ مثلاً ایک ماں نے کہا کہ میرے دو بچے ہیں۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ میں ایک ورکنگ وومن (working woman) ہوں۔ مجھے اپنے جاب کے لیے روزانہ گھر سے باہر جانا پڑتا ہے۔ جب میں باہر جاتی ہوں تو

اپنے بچوں سے سختی کے ساتھ یہ کہہ کر جاتی ہوں کہ دیکھو، یہ کرنا اور وہ نہ کرنا۔ پھر اس نے ہنستے ہوئے کہا کہ میری بیٹی کہتی ہے — ممی، تم تو ہٹلر ممی ہو۔

یہ گفتگو ٹیلی فون پر ہو رہی تھی۔ ریڈیو کی خاتون ماڈریٹر (moderator) نے کہا کہ اِس کا مطلب ہے کہ آپ اپنے بچوں کو آرڈر کرتی ہیں۔ مذکورہ خاتون نے فوراً کہا کہ نہیں نہیں، میں آرڈر نہیں کرتی۔ مذکورہ خاتون نے اپنے بچوں کے بارے میں جو بات کہی، وہ بلا شبہ آرڈر دینے والی بات تھی۔ اِس کی تصدیق خود اس کی اپنی بیٹی کے ریمارک سے ہوتی ہے۔ اِس کے باوجود، مذکورہ خاتون نے کہا کہ نہیں نہیں۔ یہی موجودہ زمانے میں تقریباً تمام عورتوں اور مردوں کا حال ہے۔ وہ ایک بات کہیں گے اور جب اُن سے مزید پوچھا جائے تو وہ فوراً لفظ بدل کر کہہ دیں گے کہ نہیں، میرا یہ مطلب نہیں۔ یہ بھی جھوٹ کی ایک قسم ہے۔ عام جھوٹ اگر کھلا ہوا جھوٹ ہوتا ہے تو یہ جھوٹ ایک چھپا ہوا جھوٹ (کذب خفی) ہے۔ اِس قسم کا جھوٹ کسی انسان کے لیے نہایت تباہ کن ہے۔ وہ آدمی کے اندر کم زور شخصیت (weak personality) پیدا کرتا ہے۔ جن لوگوں کے اندر کم زور شخصیت ہو، اُن کا ذہنی ارتقا نہیں ہو سکتا۔ ایسے لوگوں کے اندر جنّتی شخصیت کی تعمیر نہیں ہو سکتی۔ آخرت کی دنیا میں ایسے کم زور شخصیت والے لوگ، خدا کے پڑوس میں جگہ پانے سے محروم رہیں گے — کھلا ہوا جھوٹ اگر حرام ہے، تو چھپا ہوا جھوٹ انسانی شخصیت کے لیے ہلاکت خیز ہے۔

جاری ہے۔۔

محمد مبشر نذیر

سلسلۂ سوال و جواب

علوم القرآن کے متعلق سوالات

سوال: السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، میرا علوم القرآن کے متعلق ایک سوال ہے کیا شانِ نزول کوئی اسلامی اصطلاح ہے یعنی کیا قران وسنت یا حدیث سے وجود میں آئی ہے یا یہ بعد کی کوئی علمی و فقہی اصطلاح ہے؟

جواب: وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بھائی آپ نے دلچسپ سوال بھیجا ہے۔ دراصل امین احمد اصلاحی صاحب نے "علوم تفسیر" پر اس اپروچ میں اختلاف کیا ہے۔ انڈیا کے اسکالرز نے جب تفاسیر لکھی ہیں تو انہوں نے "شان نزول" پر زیادہ فوکس کیا کہ کونسی آیت کس ٹائم نازل ہوئی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ ایک تو اس آیت کو سمجھ سکیں، پھر یہ بھی معلوم ہو جائے کہ کوئی آیت منسوخ ہو گئی ہے یا نہیں؟ اکثر مفسر اسکالرز کی اپروچ یہی گزری ہے۔

اصلاحی صاحب نے اس اپروچ سے اختلاف کیا اور انہوں نے کہا ہے کہ پوری سورۃ ایک ہی "خطبہ" یعنی اللہ تعالی کا لیکچر ہے۔ اس میں ایک ایک آیت کو الگ نہیں سمجھنا چاہیے، یہ محض کوئی ایک جملہ نہیں ہے بلکہ پوری سورۃ کا مطالعہ کر کے ہر جملے کا معنی واضح ہو جائے گا۔ اس لیے شان نزول کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو بس اس پوری سورت کا شان نزول آپ دیکھ لیں جو محض تاریخی انفارمیشن ہی ہے۔ رہی ناسخ و منسوخ تو خود اسی سورۃ میں ایک جملے کے ساتھ اگلے جملے میں ناسخ آیت آجاتی ہے اور یہ صرف چار آیات ہی ہیں جو منسوخ ہوئی ہیں۔

یہ منسوخ آیات صرف وہی ہیں جس میں ایک خاص ٹائم کے لیے کوئی ذمہ داری دی گئی تھی، بعد میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مجبور ہو گئے تو ان پر حکم کی تبدیلی کر دی گئی تھی مثلاً روزے کی جگہ اجازت دی کہ وہ روزہ رکھنے کی بجائے کچھ رقم غریب لوگوں کو دے سکتے ہیں۔ بعد میں اگلی آیت میں ہی بتا دیا گیا ہے کہ اب اس کی ضرورت نہیں ہے بلکہ آپ روزہ ہی رکھیں۔

اسی طرح سورۃ انفال میں جنگ بدر تک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر ذمہ داری تھی کہ وہ جہاد میں جب آپ کی طاقت مجرمین کی نسبت صرف 10 فی صد بھی ہو تو، تب بھی آپ پر جہاد کی ذمہ داری ہے۔ پھر جنگ بدر کے بعد بہت سے لوگ ایمان لائے تو اللہ تعالی نے بتایا کہ اب آپ میں کمزوری آگئی ہے کیونکہ نئے ایمان لانے والے ابھی میچور نہیں ہیں۔ اس لیے جہاد کی ذمہ داری یہی کر دی کہ اگر آپ مجرمین سے 50٪ تک طاقتور ہو تو آپ جہاد کریں۔ یعنی یہاں پر ذمہ داری کم ہو گئی کہ وہ صرف ڈبل دشمن تک جہاد کرنے کے لیے ذمہ دار ہیں ورنہ پہلے دس گنا زیادہ دشمن سے جہاد کرنے کی ذمہ داری تھی۔

تفسیر کی یہ اپروچ اصلاحی صاحب کی زیادہ اہم ہے کہ پوری سورۃ ہی کا مطالعہ کرنا چاہیے اور جملے کو الگ الگ نہیں کرنا چاہیے۔ ہاں تاریخی اعتبار سے شان نزول اہم ہے لیکن اسی سورت کے اندر جو ڈسکشن چل رہی ہوتی ہے، وہیں سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ سورت کس ٹائم نازل ہوئی تھی مثلاً سورۃ الانفال میں واضح ہے کہ جنگ بدر کے ساتھ نازل ہوئی ہے۔ اسی طرح سورۃ توبہ میں واضح ہے کہ یہ آخری سورت نازل ہوئی ہے۔

سوال: کیا مرحومین کے نام سے قربانی کی جاسکتی ہے یا ان کے نام سے حصہ رکھا جاسکتا ہے؟

جواب: قرآن مجید اور احادیث کا پورا مطالعہ کر لیجیے تو اس میں آپ کے سوال کا جواب نہیں ملتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مرحومین نے اپنی زندگی میں کوئی نیکی کا پلان اور ارادہ کر لیا لیکن پھر وہ فوت ہو گئے تو انہیں اجر ملے گا۔ اب مرحومین کی اولاد کو معلوم ہے کہ ان کے والد یا والدہ یہ چاہتے تھے تو انہوں نے وہ نیکی اپنے والدین کے نام پر کر دی تو پھر امید ہے کہ انہیں اس نیکی کا اجر تو ملے گا اور ساتھ اولاد کو بھی اجر ملے گا انشاء اللہ۔ اس میں قربانی، نماز، روزہ، صدقات، حج، عمرہ کچھ بھی نیکی ہو تو اصل میں مرحومین کی نیت کی بنیاد پر انہیں اجر مل جاتا ہے۔ اس کا جواب ان احادیث میں ہے:

عائشہؓ سے روایت ہے: "بیشک رسول اللہ ﷺ نے سینگوں والا ایک مینڈھا لانے کا حکم دیا جس کے ہاتھ پاؤں، پیٹ اور آنکھیں سیاہ ہوں چنانچہ وہ آپؐ کے سامنے لایا گیا تاکہ آپؐ اس کی قربانی کریں۔ پھر آپؐ نے ان سے فرمایا: اے عائشہ! چھری لاؤ۔ پھر آپؐ نے فرمایا: اس کو پتھر پر تیز کرو۔ انہوں نے حکم کی تعمیل کی، پھر آپؐ نے چھری کو تھاما اور مینڈھے کو ذبح کرنے کے لیے لٹا دیا۔ پھر آپؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے نام کے ساتھ! اے اللہ! محمد، آل محمد اور امت محمد کی طرف سے قبول فرما۔ پھر آپؐ نے جانور کو ذبح کیا۔" (صحیح مسلم۔ کتاب الاضاحی)

عن أبي رزينٍ رجلٌ من بني عامرٍ أنَّهُ قالَ: يا رسولَ اللَّهِ إنَّ أبي شيخٌ كبيرٌ لاَ يستطيعُ الحجَّ ولاَ العمرةَ ولاَ الظَّعنَ. قالَ: احجج عن أبيكَ واعتمر. (صحيح أبي داود: ١٨١٠)

ترجمہ: ابورزین عقیلی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سوال کیا: اے اللہ کے رسول میرے باپ بہت بوڑھے ہیں، حج وعمرہ نہیں کرسکتے اور نہ ہی سواری پر بیٹھ سکتے ہیں؟ {تو کیا میں ان کی طرف سے حج و عمرہ کروں؟} آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے باپ کی طرف سے حج وعمرہ کرو۔

اسی دوسری حدیث میں وضاحت ہے کہ ابورزین عقیلی رضی اللہ عنہ کے والد صاحب حج وعمرہ کرنا چاہتے تھے لیکن طاقت نہیں تھی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اجازت دے دی کہ صحابی اپنے والد کی طرف سے حج وعمرہ کر لیں۔ اسی سے قیاس آپ قربانی، نفل نماز، روزہ، زکوۃ، صدقات سبھی پر قیاس کرسکتے ہیں۔

نکاح میں ولی کی ضرورت کے متعلق سوالات

سوال: السلام علیکم! سر امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہو گا کہ پچھلے دنوں مین ایک لڑکی کا کیس عدالت میں چل رہا تھا۔ اُس لڑکی نے اپنی مرضی سے شادی کی تھی، گھر سے بھاگ کر۔ اس صورتِ حال کو سامنے رکھتے ہوئے چند سوالات پیدا ہوتے ہیں جو کہ درج ذیل ہیں۔

I۔ کیونکہ لڑکی کا نکاح ولی کی اجازت کے بغیر ہوا ہے اِس لیے یہ بحث چھڑی ہوئی ہے کہ ولی کی اجازت کے بغیر نکاح ہوتا ہے یا نہیں؟ اِس بارے میں آئمہ اربعہ کا کیا مؤقف ہے؟ نیز اِس معاملے میں ولی کی اجازت کے حوالے سے صحیح ترین نقطۂ نظر کیا ہے؟ کیا آج کے دور میں بھی ولی کی اجازت کے بغیر لڑکی کو نکاح کرنے کی اجازت ہے؟

جواب: اس حوالے سے دین میں قرآن و سنت کا جو قانون ہے، پہلے اسے دیکھ لیجیے۔ قرآن مجید میں تو واضح ہے کہ شادی کا فیصلہ اس لڑکے اور لڑکی ہی نے کرنا ہے اور ان کا اتفاق ہو جائے اور ان کا اعلانیہ فیصلہ سامنے آ جائے تو شادی ہو جاتی ہے۔ فیصلہ ان دونوں ہی کا ہے کسی اور کوئی قانونی اتھارٹی نہیں ہے۔

اب آپ کے سوال کے بارے میں آتا ہے کہ ولی کا ہونا کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے، بلکہ ایک لاجکل سلسلہ ہے۔ قدیم زمانے میں انسانوں میں اچھا طور طریقہ گزرا ہے کہ لڑکا اور لڑکی دونوں اپنے والدین کو بھیجتے رہے ہیں اور وہ اعلان کر دیتے تھے۔ انسانوں نے تجربے میں یہ دیکھا ہے کہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اکثر فیصلہ تو کر لیتے ہیں لیکن کچھ مہینوں بعد ان کی غلطی سامنے آ جاتی ہے اور کچھ عرصے بعد طلاق ہو جاتی ہے۔ اس لیے ہر مذاہب کے انسانوں نے یہی طریقہ نکالا ہے کہ والدین اور نہ ہوں تو ولی (قبائلی علاقے میں) اپنے تجربے کی بنیاد پر ان کا فیصلہ کر دیں۔ مسلمانوں میں بھی یہی طریقہ گزرا ہے لیکن اچھے والدین یہی کرتے رہے ہیں کہ وہ پورا تجزیہ کر کے اپنے بچوں کو صورتحال بتا دیتے ہیں اور پھر فیصلہ تو انہی لڑکے اور لڑکی نے کرنا ہے۔

شریعت میں ولی کی اجازت کی نکاح میں کوئی حیثیت نہیں ہے لیکن بس پریکٹس کے طور پر اسے جاری رکھا ہے۔ ہاں اگر والدین یا ولی نے غلطی کر دی ہے تو پھر حکومت ان کی غلطی کو ٹھیک کر سکتی ہے۔ اس کے لیے ایک حدیث یاد ہے کہ ایک والد نے اپنی بیٹی کا نکاح کروا دیا اور بیٹی کو وہ لڑکا پسند نہیں تھا۔ وہی لڑکی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئی اور انہوں نے درخواست کی کہ میرے والد نے نکاح کر دیا لیکن مجھے وہ لڑکا پسند ہی نہیں ہے۔ چنانچہ اسی وقت ہی چند منٹ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس نکاح کو کینسل کر دیا۔

اب ائمہ اربعہ کے فتاوی کو آپ خود سرچ کر لیجیے تو آپ کو یہی اصول اپلائی نظر آئے گا۔ اس میں بعد کی صدیوں میں جو فتوے لوگوں نے اپنے کلچر کے لحاظ سے دئے ہیں، انہیں بالکل چھوڑ دیجیے اور صرف ائمہ اربعہ ہی کے فتاوی کو سرچ کریں اور ان کی دلیل ضرور ڈھونڈنے کی کوشش کریں۔ امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کی اپنی کتابیں تو موجود نہیں ہیں، لیکن ان کا نقطہ

نظر امام یوسف اور امام محمد رحمتہ اللہ علیہا کی کتابوں میں مل جاتا ہے۔ امام مالک رحمتہ اللہ علیہ کے اجتہادی فتاوی کو ان کے شاگردوں نے لکھا ہے۔ امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کے ہاں ان کی اپنی کتابیں آپ کو مل جائیں گی۔ اب میں بھی یہ کام کر دیتا، لیکن یہ لمبا کام ہے اور کے لیے ایک کتاب کا اچھا خاصا چیپٹر بن جائے گا۔ اس کے لیے آپ خود کوشش کر لیجیے اور جہاں غلطی نظر آئے تو ضرور پوچھ لیجیے۔

II۔ اِس مخصوص کیس میں اگر دیکھا جائے تو دعا زہرہ کے والدین کی طرف سے یہ کہا جا رہا ہے کہ لڑکی کی عمر 14 سال ہے اس لیے وہ بالغ نہیں ہے۔۔ اور دستورِ پاکستان کے مطابق شادی کے لیے لڑکی کی کم سے کم عمر 16 اور لڑکے کی کم سے کم عمر 18 سال ہونی لازمی ہے۔۔ کیا اسلام میں کوئی عمر کا تعین ہے کہ مخصوص عمر کو پہنچنے پر لڑکی اپنی شادی کر سکتی ہے؟

جواب: اس بارے میں قرآن و سنت میں کوئی حکم موجود نہیں ہے۔ اتنا ہے کہ لڑکا لڑکی شعور کی حالت میں ہوں۔ علماء نے اپنے زمانے کے لحاظ سے تجربہ کرتے ہوئے عمر طے کی ہے جس کی حیثیت ان کے اجتہاد کی ہے۔ میں نے بچپن میں حنفی فقہاء کا فتوی پڑھا تھا کہ لڑکا 12 سال میں بالغ ہو جاتا ہے اور لڑکی 10 سال میں، پھر نکاح ہو سکتا ہے۔ میں اسی پر عمل کرنے کی خواہش رکھنے لگا اور 8 سال تک ٹنشن میں رہا کہ اب تک نکاح کیوں نہیں ہو سکا؟ کیوں کہ میری عمر تو بالغ ہونے کی ہو گئی ہے۔ بالآخر جب میں 20 سال کا ہوا تو تب نکاح ہو گیا کیونکہ میرے استاذ حنفی عالم تھے اور انہوں نے اسی فتوی کی بنیاد پر فیصلہ کر دیا۔

ایک بار کراچی میں ایک لطیفہ یہ ہوا کہ میں نے یہی فتوی کچھ کولیگز میں سنا دیا۔ اس وقت ایک دہلی کے بزرگ سعید صاحب تھے جو ہمارے ساتھ جگت بہت کیا کرتے تھے اور مجھ سے تو پنجابی میں بھی کسی حد تک کر لیتے تھے۔ فرمانے لگے: "ارے میاں جاؤ! دہلی اور کراچی میں میں نے کبھی 12 سال کا بالغ نہیں دیکھا، ہاں تمہارے جہلم میں کوئی ایک آدھ 12 سال کا بالغ ہو گیا ہو گا تو اسی پر کسی مولوی نے فتوی دے دیا ہو گا۔"

III۔ اگر دیکھا جائے تو بائیولوجیکلی تو لڑکی 12، 11 سال کی عمر میں بالغ ہو جاتی ہے لیکن اس میں دنیا داری کے معاملات کی اتنی سمجھ بوجھ نہیں ہوتی۔ تو ظاہری بات ہے کہ اسلام صرف بائیولوجیکلی تو اجازت نہیں دے گا کہ نکاح صرف جنسی تلذذ کے لیے کیا جائے وہ لازماً دوسری معاشرتی، نفسیاتی ضروریات کو بھی پیشِ نظر رکھے گا۔ تو اس حوالے سے صحیح اسلامی نقطۂ نظر کیا ہے کہ کس عمر کی لڑکی کو اپنی شادی کرنے کا مکمل اختیار دیا جا سکتا ہے؟؟ کیونکہ بلوغت تو وہ 12، 11 سال میں ہی حاصل کر لیگی لیکن ذہنی پختگی نہیں؟

جواب: اس میں دین کا کوئی حکم نہیں ہے۔ اس میں فقہاء نے اپنے علاقے اور اپنے کلچر کے حساب سے فتوے کیے ہیں۔ اس میں آپ اپنے تجربے کی بنیاد پر خود فتوی دے لیجیے۔ کراچی کے لوگ زیادہ میچور ہیں، انہوں نے عمر کی بجائے، اس پر فوکس کیا ہے کہ جسمانی بلوغت، ذہنی بلوغت اور معاشی بلوغت یہ تینوں ہوں تو تب شادی ہونی چاہیے۔ چنانچہ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ

کراچی میں 30 سال سے کم عمر کا کوئی لڑکا نہ ملے گا جس کی شادی ہو گئی ہو۔ لڑکیاں 25 سال میں ہی جا کر شادی کرتی ہیں۔ پنجاب کا کلچر مختلف ہے اور اس میں آپ کو کم عمر نظر آئے گی۔

IV۔ کیا آج کے دور میں ریاست یہ قانون سازی کر سکتی ہے کہ لڑکی کو اپنے ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کا حق حاصل نہیں ہے، کیونکہ آج کی صورتِ حال کافی گھمبیر ہے؟

جواب: بالکل ایسا ہی ہونا چاہیے۔ پاکستان میں تو کافی حد تک ہو گیا ہے اور فیملی کورٹس کے فیصلے بھی اچھے آ رہے ہیں۔ قانون سازی بھی معقول ہونی چاہیے اور پھر ہر شخص پر الگ الگ صورتحال دیکھ کر فیملی کورٹ ہی اچھا فیصلہ کر سکتی ہے۔

V۔ مختلف گینگز لڑکیوں کو بہلا پھسلا کر نکاح کر لیتے ہیں اور پھر بیرونِ ملک ہیومن ٹریفکنگ کی صورت میں فروخت کر دیتے ہیں۔۔ ظاہری سی بات ہے کہ ایسی قانون سازی کرنے سے لڑکی کا بنیادی حق تو سلب ہو گا لیکن ایک بڑی قباحت سے بچانے کے لیے اسلامی نقطۂ نظر سے کیا ایسی قانون سازی کو سندِ جواز فراہم کیا جا سکتا ہے؟

جواب: اس کا وہی کیس ہے جو میں نے حدیث میں عرض کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لڑکی کی بات سن کر ہی فیصلہ کر کے نکاح کو کینسل فرما دیا تھا۔ پھر ان کے والدین کو بلا کر انہیں بھی صورت حال بتا دی۔ اس سے ہمیں ہدایت مل سکتی ہے۔ اس میں یہ عرض کروں گا کہ اجتہادی فتاوی کو انسانی عمل ہی سمجھیں۔ قرآن و سنت میں جو کچھ ہے، بس وہی دین ہے اور باقی اجتہادی فتوے انسانی عمل ہے۔ اسی پر تو میں نے جدوجہد کی ہے علم الفقہ کی خدمت میں تاکہ لوگوں کے ذہن کھلے ہو جائیں اور تقلید سے جان چھوٹ جائے۔ ایسے اہم کیسز کو میں نے اکٹھا بھی کر دیا ہے۔ اس کے لئے اس لنک سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ 2869=https://mubashirnazir.org/?p

VI۔ آپکی بات سے میں جو سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ لڑکی ولی کی اجازت کے بغیر بھی نکاح کر سکتی ہے؟

جواب: قانونی طور پر نکاح تو ہو جائے گا۔ لیکن ولی کے بغیر آپ عین ممکن ہے کہ دونوں افراد کی فیملیز میں آپس میں دشمنی پیدا ہو جائے۔ اسی لیے فقہاء "مصلحت" کو اہم اصول بیان کرتے ہیں جس میں قانون سازی ہو۔ فیملی کورٹ میں بھی ایسی صورتحال دیکھ کر ہی جج فیصلہ کرتا ہے۔ ہمارے ہاں فقہاء بھی تمام مصلحتوں کو دیکھ کر ہی اپنے زمانے میں فتوی دیتے تھے۔ موجودہ زمانے کے بہت سے فقہاء نے میتھس کی طرح فتوے بنانے شروع کیے، جس میں یہ مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔

VII۔ کیا نکاح کے لیے ولی کی موجودگی اور عدم موجودگی والی احادیث و آثار کی حیثیت وقتی ہے؟

جواب: احادیث اور آثار میں اوور آل اصول کی بنیاد پر ارشادات ہوئے ہیں، کہ لڑکا لڑکی کی شادی ہی نہیں ہوتی ہے بلکہ دو فیملی اور دو قبائل میں آپس میں رشتہ پیدا ہوتا ہے۔ شادی سے دو فیملز یا دو قبائل میں دوستی بھی بن سکتی ہے اور دشمنی بھی۔ اس لیے یہ تمام مصلحتوں کو دیکھ کر ہی فیصلہ کرنا چاہیے۔ اس لیے آپ کو ان احادیث اور آثار میں وقتی فیصلے ہی نہیں ملتے بلکہ پوری

صورتحال کو دیکھ کر اور مصلحتوں کو سامنے رکھ کر فیصلے ملتے ہیں۔ ہمارے ہاں غلطی یہی ہوتی ہے کہ حدیث میں پوری صورت حال نہیں لکھی گئی ہوتی، تو پھر فقہاء آپس میں اختلاف کرنے لگتے ہیں اور پھر مناظرے شروع ہو جاتے ہیں۔ اسی حدیث کو دیگر کتابوں میں دیکھ لیں تو تب پوری صورت حال اور مصلحتیں سامنے آ جاتی ہیں۔

VIII۔ کیا لڑکی کا نکاح کے لیے مخصوص عمر کو پہنچنا بھی ایک اجتہادی معاملہ ہے؟

جواب: جی ہاں۔ یہ اجتہاد ہی ہے کہ فقہاء نے اپنے علاقے، کلچر، ماحول اور اس زمانے کی صورتحال کو دیکھ کر ہی فتوے دیے ہیں۔ آپ کو انڈیا اور پاکستانی پنجاب کے کلچر کے اثرات، آپ کو فقہاء کے فتاوی میں ملیں گے۔ جیسے پیدائش کے وقت ہی ماں باپ اپنے دوست فیملی کے ساتھ نکاح کرتے رہے ہیں۔ فقہاء بھی اسی کلچر سے پیدا ہوئے اور ان کی پرورش اور تربیت ایسی ہی گزری تو لہذا آپ کو ایسے فتاوی بھی نظر آئیں گے۔

معاشرت کے متعلق سوالات

سوال: السلام علیکم! بھائی میرے سوالات عدت کی علت کے متعلق ہیں۔ برائے مہربانی ترتیب اور تفصیل کے ساتھ جواب عنایت فرمایئے۔

I۔ طلاق کی صورت میں تین حیض یا تین ماہ عدت کی مدت کی عِلت کیا فقط "حمل کی موجودگی" کو معلوم کرنا ہے؟ اگر آج کے دور میں کسی نئی ٹیکنالوجی کے ذریعے یہ کنفرم ہو جائے کہ حمل کا کوئی چانس نہیں تو کیا پھر بھی تین حیض تک انتظار کرنا ہو گا یا اُسی وقت عدت ختم ہو جائیگی؟

جواب: عدت کی حیثیت پر پہلے غور فرمالیجیے کہ عدت صرف یہ ہے کہ جب بھی طلاق ہو جائے یا شوہر فوت ہو جائے تو بیگم پر یہ ہے کہ عدت کے پیریڈ میں وہ اگلی شادی نہیں کر سکتی۔ بس اتنی ہی لمٹ ہے اور یہ الگ بات ہے کہ انڈیا کے کلچر میں فقہاء نے عدت میں مزید پابندیاں عائد کر دی ہیں ورنہ ان کی دین میں کوئی حیثیت نہیں ہے۔ عدت کا مقصد صرف یہی ہے کہ خاتون کے پیٹ میں اگر کوئی بچہ موجود ہو تو وہ سامنے آ جائے اور بس۔ دین ہر ٹائم کے لیے ہے اور عہد رسالت میں انسان کو کوئی اور طریقہ معلوم نہیں تھا، اس لیے ہر مرحلے کے لیے ایک خاص ٹائم قرآن مجید میں واضح کر دیا گیا ہے کہ طلاق کی صورت میں تین پیریڈ تک کا ٹائم اور بیوہ خاتون کے لیے چار ماہ دس دن کی عدت ہے۔

اب جدید زمانے میں ٹیکنالوجی میں الٹرا ساؤنڈ اور دیگر طریقوں سے معلوم ہو جاتا ہے کہ بچے کے ہونے یا نہ ہونے کی صورت حال سامنے آ جاتی ہے، اس لیے عدت تو پہلے ہی معلوم ہو جاتی ہے۔ اس لیے ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بیوہ خاتون کا بچہ پہلے ہی پیدا ہو گیا تو پھر ان کی عدت ختم ہو گئی تھی۔ طلاق میں البتہ ایسی کوئی حدیث موجود نہیں ہے۔ اس لیے یہی کرنا چاہیے کہ الٹرا ساؤنڈ میں صورت حال معلوم بھی ہو جائے تب بھی خاتون کو چاہیے کہ وہ صرف 80-90 دن تک انتظار کر لیں۔ اس لیے کہ عدت میں دیگر فوائد بھی ہیں۔ مثلاً محض غصے میں شوہر یا بیگم کی طلاق ہو رہی ہو، تو تب بھی فائدہ ہے کہ

اگلے 80-90 دن تک دونوں میں غصہ ختم ہو کر عقل کے ساتھ فیصلہ بھی کر سکیں گے۔ اسی طرح فنانشل معاملات بھی واضح ہو جائیں گے۔ عین ممکن ہے کہ پہلے بھی بچے موجود ہوں اور طلاق کے بعد ان کی پرورش صحیح طرح نہ ہو سکے۔ مثلاً ایسے کیس آپ نے سنے ہوں گے کہ رومانس کے وقت شوہر نے بیگم کو بڑی رقم جیسے بڑا گھر، گاڑی، زیورات دے دئے ہوتے ہیں، بعد میں غصہ آ گیا اور طلاق بول بیٹھے، پھر جب عقل آئی تو معلوم ہوا کہ وہ کتنا خرچ کر بیٹھے ہیں؟ ایسے کیس بھی ہوئے کہ خاتون صرف اس بڑی پراپرٹی پر قبضہ کرنے کے لئے طلاق ہی لینا چاہتی تھیں، تو اس طرح وہ فراڈ ہی کی شکل تھی۔ اس لیے عدت میں یہ فوائد بھی ہیں کہ فیملی کورٹ صحیح شکل دیکھ کر ہی طلاق کا اطلاق Impliment کر سکتی ہے۔

II۔ ایک روایت ہے جس میں ایک سبیعہ نامی خاتون نے شوہر کی وفات کے 15 دن بعد بچے کو جنم دیا اور اُسی وقت اُن کی عدت ختم ہو گئی اور دو اشخاص نے اُن کے لیے نکاح کا پیغام بھیجا۔ کیا خاوند کی وفات کی صورت میں بھی عدت کی علت وضعِ حمل ہی ٹھہرے گی یا 4 ماہ 10 دن پورے کرنا ہونگے؟

جواب: بیوہ خاتون کے لیے تو بڑا ایشو بھی نہیں ہے۔ اس لیے اس روایت میں یہ ہے کہ بچہ ہو گیا تو بیوہ خاتون کی صورت حال واضح ہو چکی تھی، اس لیے معاملہ ختم ہو گیا۔ موجودہ زمانے میں البتہ یہ ضرور دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ اب اس بچے کی پرورش کیسے ہو سکے گی؟ اگر یہ خاتون، ان کے رشتے دار سب اچھی طرح سوچ لیں کہ بیوہ خاتون اب جن صاحب سے شادی کر رہی ہیں تو وہ اگلا شوہر مخلص آدمی ہے اور وہ بچے کی اچھی طرح پرورش کرے گا تو پھر ٹھیک ہے۔ اگر وہ مخلص نہیں ہوا تو پھر مسائل پیدا ہو سکتے ہیں، اس لیے فیملی کورٹ یا سب رشتے داروں کو دیکھ کر ہی فیصلہ کرنا چاہیے۔

اس کے لیے ایک سچا کیس شیئر کرتا ہوں جس میں میرا تعلق رہا ہے اور میں ان کی خدمت کرتا رہا۔ ایک خاتون بیوہ تھیں اور ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ شوہر فوت ہوئے تو ان کے والد زندہ تھے اور وہ اپنی پوتیوں کی پرورش کرتے رہے اور بہو کی بھی معاشی خدمت کرتے رہے۔ اس میں 5-6 سال گزرے اور پوتیوں کی اچھی طرح پرورش ہوتی رہی۔ پھر سسر صاحب فوت ہو گئے۔ لیکن انہوں نے وفات سے پہلے ہی اپنا گھر اپنے بیٹوں کی بجائے، اپنی بیوہ بہو کو دے دیا تھا تاکہ یتیم پوتیوں کی باقی زندگی گزر سکے۔

اب بیوہ خاتون کو معاشی مشکلات پھر بھی پیدا ہوئیں، تو انہوں نے دوسری شادی کر لی لیکن وہ شخص مخلص نہیں نکلا۔ وہ سوتیلی بیٹیوں پر تشدد کرتا رہا اور کچھ سال میں اسی خاتون کے مزید بیٹے بیٹیاں پیدا ہوئے۔ اس عرصے میں اس شخص نے اپنی بیگم سے زبردستی اس گھر پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ اب سوتیلے بھائی بہنوں میں آپس کی لڑائیاں بھی شروع ہو گئیں۔ اس گاؤں کے رہنے والوں کو ان کی حالت معلوم تھی چنانچہ اس خاتون کے وفات شدہ شوہر کے مخلص دوست نے بیٹیاں لے لیں اور ان کی پرورش کرتے رہے اور جب وہ جوان ہو گئیں تو ان کی شادیاں بھی کروا دیں، تب ان کی زندگی اچھی حالت میں آ گئی۔ لیکن ان کے دادا کے گھر پر قبضہ تو سوتیلے باپ ہی نے کیے رکھا اور اس نے بعد میں وہ گھر اپنے سگے بیٹے کو دے دیا اور اس کے بعد بیگم کو

طلاق بھی دے دی۔ اب وہ بیچاری خاتون زندگی کے آخری ایام تک اپنی پہلی بیٹی اور داماد کے گھر میں رہیں اور کافی عرصے بعد 2010 میں ان کا انتقال ہوا۔

Question:1

Assalamu Alaikum ustad.

Its been over a year since I am facing this problem.I have really high sexual desires.I always fall for masturbation. I really dont know how to get relief from it.I would like to know your kind advice. (I can't fast because family wont let me do it).Jazakallah khaira.

Answer:

Wa alaikum us Salam wa Rahmatullah e wa Barakatuhu Son

It is normal phenomena which happen with every youth boy because due to age, sexual demand increases a lot. According to Shari'ah, you must avoid from ladies and boys to do sex because it is the biggest sin.

For mostarbation, nothing is mentioned in the Quran and Hadith. To minimize mostarbation, the solution is that you should avoid sweets because sexual demand increases due to energy in the blood. After some times, when you will be merried, then you will not need mostarbation as you and your wife will conduct sex and then you will enjoy sweets as well. Avoiding sweets, mostarbation will exist but at least it will be minimized.

Some special suggestions regarding this are following;

1. Watching porn videos is the main leading cause to masturbation. So, if you can avoid it then it will help you to get rid of it indirectly.
2. Eating fast food (pizza, burger, pasta) and meat products boost up your sexual desires..So you must keep check on eating these kind of things..
3. Try to spend your time in gatherings... Don't be alone in a room. When you are alone your emotions will compel you to do negative things. You can also ask a friend or a family member to have an eye on your daily business and if they find you alone with a mobile they should ask you "What are you doing?"
4. Offer prayers five times a day and pray to Allah Almighty to bless you to get out of this problem.
5. Recite Surah Yusuf with translation. There is a huge lesson for us in Hazrat Yusuf (A.S) and Zaleekha's story.. Whenever a sexual desire or negative emotion overpowers you, seek immediately for Almighty's help.. It will definitely work as did in Hazrat Yusuf case.
6. Take this worldly life as a test.. And the real test is when shaitan or negative emotions compel you to do a haraam or forbidden thing, and you maintain

your sanctity... This is not a test when you are always in a gathering and say that I don't do masturbation or anything like this.. Because in the gathering you don't have any urge.. The urge will always come to you when you are alone... So, keep it in mind that if you do a negative thing 10/10 and don't do it when no urge then you are failing the test...

Question:

Assalma aliakum .

I got your contact from a dear friend of mine. I am in dilemma and could really use your help if you answer my question.

So, I work in a company which is internationally operational in the construction business. Its regional branch is in Bahrain for the middle east section. We have a regional manager responsible for the business in this area (He is not the owner of the company) but may hold a small share. In our profession, we outsource works and buy a lot of material from other traders and contractors.

The nature of this company is OK and it has many partners. Your head is a small share partner which is OK and as an employee or partner, you are purhcasing material which is right OK. The nature of this company is Halal.

If I retain my job in this company and open another company wherein I outsource works or buy materials through my newly founded company with the permission of my regional manager and legal registration in our country , will the profits earned be halal or haram?

Answer:

Yes, it is Halal as your company. During buying or purchasing is Halal and you outsource it due to legal constrant. It is OK and according to the Quran and Sunnah, it is Halal. According to Shri'ah, the Haram is any thing when we misuse or illegal fund of other persons because it is expolitation. If you don't do it in any explolitation of other persons, then all the transactions are Halal.

Question:

The catch here is that my regional manager cannot communicate this to the head office or the owner and will act solely on his authority in managing the local works . He will also be a share holder in this new company so his decisions could be in favor of the new company and ultimately reduce profits for the head office. But by doing this he is ensuring that his best employees do not leave their jobs and keep working with him.

Answer:

In this situation, a sort of expolitation can be done. But if the owner, has given all the authority to the Regional Manager and he informed the onwer that he hold a new company and he is purchasing / selling products of new company and the owner agreed with it, then there is no expolitation so it is Halal.

But if such situation is not informed to the owners, then it will be supecision activity which may be misuse and exploitation about the parent company and their owners. In such scenario, it may be Haram or Halal in different transactions. Therefore, the Regional Manager should explain all the situation to the owners of the parent company so that they will give authority or not.

Question:

The question is that even though I have taken the regional manager's permission, the truth is hidden from the owner so will that make my earnings haram if I proceed with this plan?

Answer:

Such suspicion transactions may be Halal or Haram and such responsibility about the Regional Manager. You are employee or the Regional Manager. To avoid any Haram activity, you should give suggestion to the Regional Manager to give transparent information to the onwers. If he do it and they give authority, then it is OK and Halal. Otherwise, if the owners disagree and they don't give authority to the Regional Manager, then his transactions will be illegal and Haram.

For your responsibility, you should check a sample of transactions and confirm that the Regional Manager ask you to do legal Halal activities, then your job will be OK and Halal. If the Manager ask you to conduct some illegal suspecious activities which is unauthority of the Regional manager, then you should try to get some other job and get rid of such Haram activities. After getting some other job, then it will be easy for you to give all such information of unauthorized transactions to the owners to give help them.

Please let me know what you think and if you have any more questions please ask.Most welcome all the time. In future, whatever questions appear in your mind, feel free to send to me. If some transactions are authorized for the Regional Manager, then it is OK and Halal. If some transactions are unauthorized for him, then it is Haram. If you find some transactions, which are suspecion, you can provide me the details and as an "Auditor" I can advice you whether is it Halal / Haram. If you need Urdu, then please see my books and lectures on the topic of business transactions in Al-Fiqh. Otherwise, you can see my lecture in English about audit.

https://mubashirnazir.org/?p=2925
https://mubashirnazir.org/?p=2869
https://www.youtube.com/watch?v=ee2LPXAzGMc

Question:

One of my friends asked me a question but I couldn't reply him, that was:

"If only Islam is the true religion then why Allah didn't make all World Muslim?"

Answer:

1st of all, we should confirm that "Islam" or "Muslim" is usually used in a nation.

According to the Quran, the word "Islam" is the literal meaning "Becoming Surrender to God". Any person from any country and any nation, if he/she is surrender to God, then he/she is a real Muslim. Now, we go to the question.

According to the Quran, Allah has allowed for human persons that they have authority to select becoming surrender to God or not. This scheme is created that Allah allow for different creation but all of them sorry that it is difficult for us. It is is man who accept it, then God give authority to humanity. Now, whether they can surrender to God or not then God has explained that the result will be available for you to get unlimited life. The details is the topic of the Quran, please read the following sentences and I give lectures on it.

Al Baqarah 30-39 – Objective of this Life of Humanity & Historical Evidence of Exam of this Life

https://youtu.be/T2BAwNNvZX8

Al Ahzaab 28-73- Family of the Prophet vs Harassments Punishment + Finish of Prophethood (Read only in 70-73 sentences of Al Ahzaab)

https://youtu.be/6a3dI0FX8N8

Al Aa'araf 7: 1-53: Al A'raaf Surah 7 Objective of Our Life, Steps & Result

https://youtu.be/PG-8zdaFw1Q

Question:

Then he asked me to the second question:

"Suppose, there is a place where not a single Muslim never went only non muslims live there, in such condition they don't know what is Islam, will they go in the Jannah or hell?"

Answer:

Of course yes. A person does not see any Muslim but he/she surrender to God and he/she take ethical activities (which is avialable in nature in their mind) then they will enter into the Jannah Paradise. God has explained in the Quran that God has no bias with any person but every person will get benefit of his/her performance. You can see in the sentence Al-Baqarah 2:62.

Question:

If hell, why??? What is his fault, since no one told him about Islam?

Answer:

Hell will be available for those persons, who become enemies against God. A person who is not become enemy against God but he/she surrender to God and accept ethics, then he/she will enter into the Paradise due to their performance. Oppositely, if a person become enemy against God during his/her whole life e.g. Pharaoh etc. then they will go to the hell as punishment. But if an enemy understand

his/her situation during life and he/she repents to God and surrender, then he/she will go the Paradise.

Question:

If Jannah, it's even why? Because for Jannah it's compulsion to be a Muslim.

Answer:

Answer is given to God that the Jannah is not only for a nation but it is available for all the persons. You can see the sentence of the Quran 2:62.

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ. (البقرة:٦٢)

[It is evident from this that the law of reward and punishment is absolutely unbiased. Therefore,] those who have professed faith and those [before them] who became Jews, Christians, and Sabaeans etc. – whoever among them have believed in God and in the Hereafter and have done upright deeds – for them their rewards with be available from their Lord and [in His gracious presence] they shall have nothing to fear nor shall they grieve [in the hereafter].

والسلام

محمد مبشر نذیر

اسلامی کتب کے مطالعے اور دینی کورسز کے لئے وزٹ کیجئے

www.mubashirnazir.org